ماہنامہ

پیغامِ صلح

جلد ۸۰ | مئی، جون ۱۹۹۶ء | شمارہ - ۵، ۶

اس شمارے میں

ناشر: احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) یو ایس اے

پتہ: ۱۳۱۵ کنگز گیٹ روڈ، کولمبس، اوہائیو ۱۵۰۴-۴۳۲۲۱ (یو ایس اے)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ

حضرت سیدہ آمنہ

(۵)

زبان رسالتؐ سے سیدہ آمنہ کا ذکر

اگرچہ حضور اقدسؐ کو اپنی والدہ ماجدہ کے زیر سایہ چند سال ہی زندگی گذارنے کا موقع مل سکا لیکن اس کے باوجود اپنی شفیق والدہ کی محبت سے آپؐ کا دل معمور رہتا تھا اور یہ نقش آپؐ کے دل و دماغ پر اس طرح ثبت ہو گیا تھا کہ حضورؐ اسے کبھی نہ بھلا سکے اور اپنی پیاری والدہ کی شفقت کو یاد کرتے رہتے تھے۔ جب کوئی آپؐ کی والدہ ماجدہ کا تذکرہ کرتا تو آپؐ بہت ذوق و شوق سے سنتے، اسے پسند فرماتے اور خوش ہوتے۔ اس نوعیت کا ایک تاریخی واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔۔۔ لیکن پہلے تھوڑی سی تمہید۔

حضورؐ اقدس کو اطلاع دی جاتی ہے کہ روم و شام کا بادشاہ "ھرقل" ایک زبردست لشکر لے کر مملکت اسلامیہ کی سرحد کے قریب آ پہنچا ہے اور اس کا ارادہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کا ہے۔ اس اطلاع پر حضورؐ اقدس تیس ہزار پیادوں اور دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر ھرقل روم کے مقابلے کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں اور شام کے سرحدی شہر "تبوک" پہنچ کر خیمہ زن ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ بادشاہ روم کے اہل لشکر ایک لاکھ جنگجو افراد پر مشتمل تھے اور اعلیٰ درجے کے سامان حرب سے لیس بھی تھے مگر اس کے باوجود "ھرقل" چالیس ہزار مسلمانوں سے جنگ آزما ہونے کا حوصلہ نہیں پاتا جن کے پاس سامان حرب بھی نامکمل تھا۔ وہ اپنی فوج لے کر پیچھے ہٹ جاتا اور واپس چلا جاتا ہے۔ حضورؐ اقدس بہت سی سرحدی ریاستوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں جن میں "ایلہ"، "جربا"، "مقنا"، "دومتہ الجندل اور "اذرح" شامل ہیں۔ ہمارے ایک ہم عصر مورخ کے بقول "ان ریاستوں کے حکمرانوں نے رسولؐ اللہ کی برتری تسلیم کر لی اور رومی اقتدار سے کٹ کر رسولؐ اللہ کے باج گزار بن گئے۔"

جب حضورؐ اقدس تبوک سے کامیاب و کامران واپس آتے ہیں تو مدینہ کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں شہر سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کرتے ہوئے دف پر وہی گیت گاتی ہیں جو ہجرت مدینہ کے موقع پر اس وقت کی بچیوں نے گایا تھا یعنی

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

یعنی ہم پر ثنیات کی پہاڑیوں کی طرف سے چودھویں رات کا چاند طلوع ہوا ہے۔ ثنیات جمع ہے "ثنیہ" کی اور "ثنیہ" ٹیلے یا چھوٹی پہاڑی کو کہتے ہیں۔ چونکہ مدینہ کے لوگ اپنے مہمانوں کے ساتھ ان پہاڑیوں (ثنیات) تک آیا کرتے تھے اور یہاں سے انہیں رخصت کیا کرتے تھے اس لئے ان پہاڑیوں (ثنیات) کا نام "ثنیات الوداع" پڑ گیا۔ یہ پہاڑیاں مشرق اور مغرب کی اطراف میں واقع تھیں۔ یہ چار پہاڑیاں تھیں (۱) ثنیۃ البول (۲) ثنیۃ الجابر (۳) ثنیۃ مروان (۴) ثنیۃ الوداع۔ حضورؐ غزوہ تبوک سے واپسی پر جس پہاڑی کی طرف سے مدینہ میں داخل ہوئے تھے اس کا رخ شام کی طرف تھا چونکہ آپؐ شام سے فاتح کی حیثیت سے واپس تشریف لائے تھے اور یہ وہ تاریخ ساز وقت تھا جب حضورؐ اقدس کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا ایک کشف پورا ہوا تھا جس میں انہوں نے دیکھا تھا کہ حضورؐ کی ولادت کے وقت ان (سیدہ آمنہ) کے جسم سے ایسا نور نکلا تھا جس میں جناب آمنہ کو شام کے محلات دکھائے گئے تھے۔

اس موقع کی مناسبت سے حضورؐ نے اپنی والد (سیدہ آمنہ) کا یہ کشف بیان کیا۔ یہی موقع تھا جب حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے سیدہ آمنہ کا یہ کشف نظم کیا اور حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ یہ نظم آپؐ کو سنانا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے اجازت دی۔ حضرت عباسؓ نے یہ نظم حضورؐ کو سنائی جس کے کچھ شعر علامہ القسطلانیؒ امام جلال الدین سیوطیؒ اور محدث بیہقیؒ نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتب میں درج کئے ہیں۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ:-

و انت لما ولدت اشرقت الارض
وضائت بنورک الافق
فنحن فیِ ذاک الضیاء و فی النور
و سبل الرشاد نخترق (۳۶)

(یعنی اے اللہ کے رسولؐ آپؐ کی والدہ ماجدہ (سیدہ آمنہ) نے جو کشف دیکھا تھا وہ آج پورا ہوگیا اور واقعی) آپؐ کی پیدائش کی بدولت ساری زمین روشن ہو گئی اور آپؐ کے نور سے آسمان کے کنارے جگمگا اٹھے۔ ہم لوگ اسی نور میں (زندہ) ہیں اور رشد وہدایت کے راستوں پر چل رہے ہیں۔")

حضرت عباسؓ سے یہ نظم سن کر گویا حضورؐ اقدس نے اپنی والدہ ماجدہ کا کشف درست ہونے کی تصدیق فرمادی۔ پس اس موقع پر نہ صرف حضورؐ نے اپنی والدہ ماجدہ کو یاد کیا بلکہ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور صحابہ کی اس مجلس نے بھی سیدہ آمنہ کا تذکرہ سنا اور انہیں یاد کیا۔۔۔۔ اور آگے چلئے!

حضورؐ کی دایہ (کھلائی) حضرت ام ایمنؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی آپؐ کو اپنی امی یاد آ جاتی ہیں۔ حضورؐ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ۔۔۔۔ امی بعد امی (۳۷) کہہ کر ان کا استقبال کرتے ہیں یعنی فرماتے ہیں کہ وہ خاتون آ گئی جس نے میری ماں کے بعد مجھے ماں کی طرح پالا۔

ایک موقع پر حضورؐ مدینہ میں واقع اس گڑھی کے پاس سے گذرتے ہیں جس میں آپؐ کے والد ماجد دفن تھے۔ اس گڑھی کو دیکھتے ہی پھر آپؐ کو اپنی ماں یاد آ جاتی ہیں اور فرماتے ہیں کہ "میں اس گڑھی میں اپنی ماں کے ساتھ اترا تھا۔"

اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لے جاتے ہیں اسے صاف کرتے اور سنوارتے ہیں پھر زیر لب کچھ فرماتے ہیں (وہ دعا ہی ہو سکتی ہے) پھر دل بھر آتا ہے اور رو پڑتے ہیں۔ حضرت عمرؓ رونے کی وجہ دریافت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ مجھے میری امی کی شفقت یاد آ گئی تھی اس لئے میں انہیں یاد کر کے رو پڑا۔ (۳۸)

سیدہ آمنہ کی شخصیت

سیدہ آمنہ کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس وقت کے ماحول پر ایک نظر ڈالنا ہو گی۔ یہ ماحول وہ تھا جس میں عورتیں عام طور پر عشق مزاج مردوں کی ہوس پرستانہ نگاہوں کا نشانہ بنتی رہتی تھیں۔ شعرا ان کے حسن و جمال، ان کے خدوخال کی دلکشی اور ان کے شباب کی نوخیزیاں بیان کر کے خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور نوجوانوں کے جنسی جذبات میں بھی اشتعال پیدا کرتے تھے۔ مکہ کے بازاروں اور قمار خانوں میں تاجروں کی دولت حسین عورتوں پر نچھاور ہوتی تھی اور بازار کے اتار چڑھاؤ کی طرح ان کے نرخوں میں بھی اتار چڑھاؤ آتا رہتا تھا۔ ایک فاضل مستشرق مسٹر "بودلے" کے بقول گویا یہ خوبرو عورتیں تاجروں اور قماربازوں کی دولت میں شریک تھیں۔

ایک طرف تو یہ جنس زدہ ماحول تھا اور دوسری طرف اسی معاشرے میں کچھ ایسے نوجوان تھے جن کی نگاہیں پاکیزہ تھیں اور جو مکہ کی ان حسین ترین دوشیزاؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے لیکن "ان کے دلوں میں سیدہ آمنہ کو پالینے کا جذبہ کروٹیں لیتا رہتا تھا اور وہ (اپنے بزرگوں کے ذریعے) پاکیزہ خصال آمنہ کے لئے نکاح کے پیغام بھیجنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔" (۳۹)

آخر ایسا کیوں تھا؟ اس کی کچھ وجوہ تھیں۔

سیدہ آمنہ کا بچپن نہایت عزت والے گھرانے اور بہت ہی طیب پرورش گاہ میں بسر ہوا۔ ان کی ذات میں اعلیٰ نسب کی خوبیاں اور پاکیزہ حسب کی خصوصیات اس طرح جمع ہو گئی تھیں جو اس وقت کے بکی خاندانوں میں نظر نہیں آتی تھیں (حالانکہ یہ وہ خاندان تھے جنہیں اپنی شرافت اور اپنے نجیب الطرفین ہونے پر بڑا فخر تھا)۔ (۴۰)

سیدہ آمنہ مکہ کی عام دوشیزاؤں کی طرح نہیں تھیں جن کا حسن و جمال نوجوانوں میں موضوع گفتگو بنا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے شاعر اور مورخین سیدہ آمنہ کے خدوخال کی تعریف کرنے کی جرات نہ کر سکے بلکہ بیان کرنے سے قاصر رہے کیونکہ سیدہ آمنہ زمانہ جاہلیت کے طور طریقوں سے پاک و منزہ تھیں۔ وہ نہایت سنجیدہ اور باوقار خاتون تھیں۔ ان کا عہد طفولیت گذرتے ہی اشراف مکہ کے خاندانوں کی کنواری لڑکیوں کی طرح سیدہ آمنہ کو بھی پردے میں بٹھا دیا گیا۔ (۴۱) ان کی مثال اس پاکیزہ دوشیزہ کی تھی جو ایک ایسے خیمے میں بیٹھی ہوئی ہو جس تک ہوس پرستوں کی حریصانہ نگاہوں کی رسائی ممکن ہی نہ ہو۔ گویا جناب سیدہ آمنہ اپنی طہارت نفس، عفت و حیا اور نسوانی غیرت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھیں۔

پاکیزگی سیرت کی خوشبو

ہمارے دور کی ایک فاضل مصری مصنفہ نے سیدہ آمنہ کے خانوادے کی تصویر اپنے مخصوص ادیبانہ انداز میں یوں کھینچی ہے:

"(سیدہ آمنہ کے قبیلے) بنو زہرہ کے مکانوں اور حویلیوں میں سے پاکیزگی کی ایسی خوشبو اٹھتی تھی جو سارے مکہ میں پھیل جاتی تھی اور شہر کے اطراف و جوانب اس سے معطر ہو جاتے تھے۔ پاکیزگی کردار کی یہ خوشبو نوجوانوں کے نفوس میں سرایت کر جاتی تھی اور ان کی پاکیزہ خواہشات میں ارتعاش پیدا کرنے کا باعث بنتی تھی۔ یہ وہ نوجوان تھے جن کی آنکھیں اور زبانیں مکہ کی بدنام دوشیزاؤں کے حسن اور آواز کے سحر سے محفوظ تھیں۔" (۴۲)

یعنی سیدہ آمنہ کے خانوادے کے لوگ کیا مرد اور کیا عورتیں نہایت پاکیزہ سیرت کے حامل اور اوصاف حمیدہ کے مالک تھے جن میں سیدہ آمنہ سرفہرست تھیں اور اپنی پاکیزہ ترین صفات کی وجہ سے اپنے ماحول میں ایک منفرد حیثیت کی مالک تھیں۔

جناب عبداللہؓ کے دل میں سیدہ آمنہ کا مرتبہ

جس طرح سیدہ آمنہ طاہرہ و مطہرہ تھیں اسی طرح جناب عبداللہؓ بھی طاہر و مطہر تھے۔ دونوں کی پرورش ایک جیسے پاکیزہ خاندانی ماحول میں ہوئی تھی۔ دونوں ساتھ کھیلے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس اور مرتبہ داں تھے۔ جناب عبداللہؓ نے سیدہ آمنہ کی پاکیزگی کردار اور خوش خصالی کا اس وقت تک تو خود مشاہدہ کیا تھا جب وہ صغر سنی کے دور سے نکل کر شباب کی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ بلوغت کے قریب جب سیدہ آمنہ کو پردے میں بٹھا دیا گیا تو بنو ہاشم کی خواتین میں ان کی شرافت اور طہارت سیرت کے تذکرے ہوتے ہوں گے کیونکہ سیدہ آمنہ کے قبیلے بنو زہرہ اور جناب عبداللہؓ کے قبیلہ بنو ہاشم کے مکانات ایک دوسرے کے قریب واقع تھے اور دونوں خاندانوں کے مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جناب عبداللہؓ سیدہ آمنہ کے احوال سے مطلع رہتے ہوں گے۔ پس جب حضرت عبداللہؓ کی حضرت آمنہ سے شادی ہو گئی تو انہیں احساس تھا کہ وہ کتنی عظیم، خوش خصال اور پاک سیرت بی بی کے رفیق حیات منتخب ہوتے ہیں۔ اس احساس کے تحت بھی وہ سیدہ آمنہ کے ساتھ نہایت طاہرانہ زندگی گذارتے تھے، چنانچہ امام سہیلیؒ جیسے فاضل بزرگ اور سیرت نگار کا بیان ہے کہ جناب عبداللہؓ نے سیدہ آمنہ کے قریب جاتے وقت ظاہری طور پر پاک و صاف ہونے کے ساتھ ساتھ

باطنی پاکیزگی کا بھی اہتمام فرمایا اور ان کے پاس جانے سے قبل ---فتوضاو غسل یعنی "وضو اور غسل کیا" ۔(۴۳)

وضو کی وہ کیا صورت تھی جس پر جناب عبداللہ نے عمل کیا؟ اور غسل کرنے سے پہلے جسم کے کون کون سے حصوں کو دھویا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی عربی میں وضو کے معنی ہیں ضیا پیدا کرنا، خود کو سنوارنا لیکن غسل تو خود سارے جسم اور چہرے کو پاک وصاف کر کے تر و تازہ اور خوبصورت بنا دیتا ہے۔ پس غسل کے باوجود اور اس سے پہلے جناب عبداللہؓ کا وضو کرنا یقیناً کوئی ایسا عمل تھا جس کا روح کی طہارت سے تعلق تھا اور سیدہ آمنہ کے پاس جانے سے قبل انہوں نے اپنے جسم اور روح دونوں میں طہارت پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ گویا انہیں احساس تھا کہ وہ ایک بہت ہی ارفع واعلیٰ اور پاکیزہ خصال خاتون سے قربت کر رہے ہیں۔

اس اہتمام کی ایک وجہ اور بھی تھی جس کا شاید اس وقت جناب عبداللہؓ اور سیدہ آمنہ دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا اور وہ یہ کہ اس تعلق قربت کے نتیجے میں سیدہ آمنہ کے بطن مبارک سے وہ عظیم اور مقدس ترین ہستی پیدا ہونے والی تھی جسے طہارت و پاکیزگی کا مجسمہ بننا تھا بلکہ جس پر خود طہارت و پاکیزگی کو نازاں ہونا تھا۔

سیدہ آمنہ ایک سلیم الطبع خاتون

عربوں میں رواج تھا کہ دوران حمل عورت کے جسم خصوصاً گلے اور بازوؤں کے ساتھ لوہے کے ٹکڑے لٹکا دیئے جاتے تھے۔ یہ ایک عبث فعل تھا اور اس کی بنیاد اوہام پرستی پر تھی۔ جب سیدہ آمنہ کے بارے میں ان کے خاندان کے بزرگ عورتوں کو معلوم ہوا کہ آپ حاملہ ہو گئی ہیں تو انہوں نے سیدہ کو بھی مشورہ دیا کہ تم بھی لوہے کے ٹکڑے اپنے بازوؤں کے ساتھ لٹکا لو اور گلے میں بھی ڈال لو۔ سیدہ آمنہ اس فعل کی حقیقت سے لاعلم تھیں چنانچہ انہوں نے بھی رواج کے مطابق لوہے کے چند ٹکڑے اپنے بازوؤں اور گلے میں لٹکا لیئے مگر وہ ٹکڑے جلد ہی ان کے جسم سے جدا ہو کر گر پڑے۔

شاید اللہ تعالیٰ اس فعل کو ایسی خاتون کے لیئے پسند نہیں کرتا تھا جو اس کے مقدس رسولؐ کی ماں بننے والی تھی۔ سیدہ آمنہ بھی اس اشارہ ربانی کو سمجھ گئیں چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں کہ:-

"اس کے بعد میں نے کبھی لوہے کو اپنے جسم کے ساتھ نہیں لٹکایا۔" (۴۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیدہ آمنہ ہر اس فعل کو جس میں شرک یا اوہام پرستی کا شائبہ بھی ہونا پسند کرتی تھیں اور حقیقت سے مطلع ہوتے ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں۔ گویا وہ فطرۃً سلیم الطبع واقع ہوئی تھیں اور فراست ایمانی ان میں اس درجے پر تھی کہ کسی کی تلقین اور نصیحت کے بغیر ہی اشارہ الٰہی پاتے ہی حقیقت تک پہنچ جاتی تھیں۔

سیدہ آمنہ ایک زیرک خاتون

سیدہ آمنہ ایک ایسے خاندان میں بیاہ کر آئی تھیں جو نہ صرف تاجر تھا بلکہ جس کے اکابر اپنے اپنے عہد کے ملک التجار تھے۔ جناب آمنہ کے خسر حضرت عبدالمطلبؓ بھی بہت بڑے تاجر تھے اور آپؓ نے اپنے فرزندوں کو بھی تجارت کی تربیت دی تھی۔ حضرت عبدالمطلبؓ کے سب سے چھوٹے فرزند اور سیدہ آمنہ کے شوہر جناب عبداللہؓ بھی پیشہ تجارت سے وابستہ تھے۔ ابھی آپؓ کی شادی کو چند ہفتے (X) ہی ہوتے تھے کہ ایک روز حضرت عبدالمطلبؓ بیٹے کے گھر آئے اور ان سے کہا کہ مکہ سے ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے میری خواہش ہے کہ تم بھی (بغرض تجارت) اس قافلے کے ساتھ چلے جاؤ۔ اردو زبان کے محاورے کے مطابق اگرچہ ابھی حضرت آمنہ کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی نہ اترا تھا کہ انہیں اپنے پیارے شوہر کے فراق کے روح فرسا لمحات کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت عبداللہؓ کا دل بھی اپنی نو بیاہتا اور عزیز از جان دلہن کو چھوڑ کر جانے

کو کب چاہتا ہو گا مگر باپ کا حکم ہر چیز اور ہر خواہش پر مقدم تھا۔

ادھر جب سیدہ آمنہ نے دیکھا کہ ان کے پیارے شوہر کو ان کے والد ایک تجارتی مہم پر بھیج رہے ہیں تو انہوں نے ایک سعادت مند بہو کی طرح اپنے خسر کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور ایک وفادار بیوی کی طرح اپنے جذبات کو اپنے شوہر کی خاطر قربان کر دیا۔ اگر وہ جذبات سے مغلوب ہو کر جناب عبداللہ ؒ کو روک لیتیں اور ان سے کہتیں کہ ! ابھی تو ہماری سیج کے پھول بھی نہیں مرجھائے ابھی سے آپ فراق کی باتیں کر رہے ہیں؟ ابا جان سے معذرت کر لیجئے، قافلے تو جاتے ہی رہتے ہیں۔ چھ ماہ کے بعد جو قافلہ جائے گا اس کے ساتھ چلے جایئے گا مگر سیدہ آمنہ نے ایسا نہیں کیا، اپنے جذبات پر قابو پایا اور اپنے محبوب شوہر کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا تاکہ ان کی وجہ سے جناب عبداللہ ؒ اور ان کے والد بزرگوار کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے جس کا اثر سیدہ آمنہ کی گھریلو زندگی پر پڑے یا مبادا حضرت عبدالمطلب ؒ ان سے بدگمان ہو کر ان کے بارے میں کوئی ناپسندیدہ رائے نہ قائم کر لیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سیدہ آمنہ نہایت معاملہ فہم اور زیرک خاتون تھیں۔ ایک بیٹی کا شوہر کے گھر جا کر نیا گھر بسانا اور اس میں خود کو Adjust کر لینا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور نئی دلہن سے بہت سی قربانیاں چاہتا ہے اس کے ساتھ ساتھ تدبر اور معاملہ فہمی کا بھی تقاضا کرتا ہے، سیدہ آمنہ اس معیار پر نہ صرف پوری اتریں بلکہ دنیا کی عورتوں کے لئے نمونہ بن گئیں۔

سیدہ آمنہ ایک مثالی خاتون

سیدہ آمنہ ایک مثالی بیٹی، مثالی بیوی اور ایک مثالی بہو تھیں۔ جب انہیں ان کے والدین نے پردے میں بٹھا دیا تو پھر کسی نے انہیں مکہ کے بازاروں، سڑکوں اور گلیوں میں نہیں دیکھا۔ وہ بلا ضرورت یا تنہا کبھی باہر نہ نکلتیں، نہ ان کے پاس غلط کردار اور نا پسندیدہ عورتوں کی آمدورفت رہتی۔ بلوغت سے شادی تک کی مدت انہوں نے اپنے والدین کی فرماں برداری کرتے ہوئے بسر کر دی۔ نہایت معتبر مورخین کے بقول شادی سے قبل ہی آخر وہ اپنے قبیلے میں "سیدۃ النسا" کے معزز و محترم لقب سے کیوں مشہور تھیں۔ (۴۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوغت کے ساتھ ہی ان میں ایسی اخلاقی خوبیاں ظاہر ہونے لگی تھیں جو قبیلہ بنو زہرہ کی دوسری غیر شادی شدہ لڑکیوں سے انہیں ممتاز کرتی تھیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، اپنی نیک اور شریف النفس سہیلیوں کے ساتھ ان کی نشست و برخواست، ان کے ساتھ محبت آمیز اور ہمدردانہ سلوک، باوقار گفتگو، ان صفات کی وجہ سے سہیلیوں کے دلوں میں ان کا حد درجہ احترام ! ----- یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر قبیلے کی لڑکیوں میں ان کا خاص مقام تھا اور انہیں کنوارپن کے زمانے میں بھی انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پس اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ ایک مثالی بیٹی تھیں اور اپنے والدین کی منشاء کے خلاف ایک قدم نہ اٹھاتی تھیں۔ ان کی جلوت اور خلوت دونوں سعادتمندی اور پاکیزگی کے گہوارے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے شریف اور نیکوکار خاندانوں کے لوگ اپنے بیٹوں کے رشتے سیدہ آمنہ کے لئے پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور انہیں اپنی بہو بنانے کے آرزو مند تھے ورنہ مکہ میں لڑکیوں کی کمی تو نہ تھی -----ہاں ----- ! ان میں سیدہ آمنہ کے سوائے "سیدۃ النساء" کوئی نہ تھی۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ سیدہ آمنہ ایک باحیا، سلیقہ شعار، سعادتمند اور فرماں بردار بیٹی تھیں اس لئے وہ ایک مثالی بیٹی اور مثالی خاتون تھیں۔

سیدہ آمنہ کے معاشی حالات

سیدہ آمنہ کے بارے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان کی رو

سے جناب عبداللہؓ اپنے پیچھے جو ترکہ چھوڑ گئے تھے ان میں اعلیٰ نسل کے پانچ اونٹ، بھیڑوں یا بکریوں کا ایک ریوڑ، ایک مکان جس میں حضرت آمنہ مقیم تھیں۔ کپڑے کی ایک دوکان جس میں کپڑا فروخت بھی ہوتا تھا اور سلتا بھی تھا اور کھجوروں اور چمڑے کا ذخیرہ شامل تھا۔ بظاہر یہ اچھی خاصی جائیداد یا سرمایہ تھا۔ سیدہ آمنہ کی سسرال تاجر پیشہ تھی۔ حضرت عبدالمطلبؓ کے بیٹے بھی تجارت اور کاروبار کرتے تھے۔ روایات کے مطابق حضرت عبداللہؓ کے انتقال کے بعد سیدہ آمنہ نے وہ سرمایہ جو حضرت عبداللہؓ چھوڑ کر گئے تھے اپنے جیٹھ جناب زبیر بن عبدالمطلبؓ کی تجارت میں لگا دیا۔ گویا سیدہ آمنہ نہایت مدبر اور دور اندیش خاتون تھیں۔ ان میں اپنی عزت نفس کی پاسداری کا احساس تھا، وہ کسی دوسرے کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا اور اس کی محتاجی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود سیدہ آمنہ کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ شاید جناب زبیر بن عبدالمطلبؓ کے ساتھ تجارت میں شرکت سے انہیں کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی اور یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ شرکت کب تک جاری رہی۔ اسی طرح جناب عبداللہ نے کپڑے کی جو دوکان ترکے میں چھوڑی تھی معلوم نہیں وہ کب تک قائم رہی اور اس سے کیا آمدنی ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہؓ نے بکریوں یا بھیڑوں کا جو ریوڑ ترکے میں چھوڑا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ یعنی اس ریوڑ میں دس بکریاں تھیں یا بیس یا اس سے کم یا زیادہ؟ تاریخ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیتی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بھیڑوں یا بکریوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

سیدہ آمنہ پر دو غلاموں (شقران اور صالح) اور ایک خادمہ ام ایمنؓ کی کفالت کا بھی بوجھ تھا، جو تھی وہ خود۔ حلیمہ سعدیہؓ کو دودھ پلانے کی اجرت اور حضورؐ کی صحرا سے واپسی پر آپؐ کی کفالت۔ گویا سیدہ آمنہ خاصے معاشی بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں لیکن آپ بہت سلیقہ شعار واقع ہوئی تھیں۔ نامساعد حالات سے عہدہ برآ ہونا اور انہیں اپنے موافق کر لینا بھی آپ کی شخصیت کی ایک قابل قدر خوبی تھی۔ اس کی تصدیق حضورؐ اقدس کے ایک ارشاد گرامی سے ہوتی ہے۔ یہاں ایک بنیادی اصول یاد رکھنا چاہیئے کہ جب بھی تاریخ کی روایات اور صحیح حدیث میں اختلاف پیدا ہو تو حدیث کو فیصلہ کن قرار دینا چاہیئے کیونکہ یہ قول رسولؐ ہے جو قرآن کے بعد سب سے افضل ہے۔ اب رسولؐ اقدس کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس پر آپؐ کی شخصیت کا ایسا رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے اسے تسلی دی اور فرمایا:

هون عليك فانى لست بملك انما انا

ابن امراة من قريش تاكل القديد (۴۶)

(یعنی گھبراؤ مت میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں (بلکہ) میں (تو) قریش کی ایک (ایسی) عورت کا بیٹا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔)

ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب سیدہ آمنہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ اگر سیدہ آمنہ کے معاشی حالات اچھے ہوتے تو آپ سوکھا ہوا گوشت کبھی نہ کھاتیں۔ عربوں میں رواج تھا کہ لوگ گوشت کو خشک کر کے رکھ لیتے تھے اور حسب ضرورت اسے پکا کر بطور سالن استعمال کرتے تھے۔ مگر یہ طریقہ وہی لوگ اختیار کرتے تھے جو مالی اعتبار سے کمزور اور غریب ہوتے تھے۔ رئیسوں اور متمول لوگوں کو گوشت خشک کر کے استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو ہر روز تازہ گوشت استعمال کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدہ آمنہ مالی اعتبار سے آسودہ حال نہیں تھیں مگر اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت جزرس اور کفایت شعار واقع ہوئی تھیں۔ کسی کی طرف دست طلب دراز کرنے کی بجائے اپنی آمدنی اور خرچ میں توازن قائم رکھتی

تھیں۔ گوشت کو خشک کر کے رکھ لیتی تھیں اور جب تازہ گوشت خریدنے کی استطاعت نہیں ہوتی تھیں تو یہ خشک کیا ہوا گوشت پانی میں بھگو کر پکا لیتی تھیں خود بھی اسی کا سالن کھاتی تھیں اور اپنے زیرِ کفالت افراد کو بھی کھلاتی تھیں۔ آپ نے عسرت میں زندگی گذاری مگر کبھی حرف شکوہ زبان پر نہ لائیں بلکہ صبر و شکر کا پیکر بن کر زندہ رہیں اور اسی حالت میں اپنے رب سے جاملیں

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۳۶) ،،دلائل النبوۃ،، لابی بکر احمد بن الحسین البیہقیؒ (السفر الخامس) مرتبہ الدکتور عبدالمعطر قلعجی۔ دار الکتب بیروت ص ۲۶۸۔

(۳۷) الروض الانف جلد اول۔ ص ۷۹ مولفہ امام سہیلی

(۳۸) طبقات الکبری۔ ص ۱۱۶، ۱۱۷ مولفہ ابن سعدؒ

(۳۹) ،،سیدات بیت النبوۃ،، مولفہ ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی۔ ص ۹۰۔

(۴۰) ،،سیدات بیت النبوۃ،،۔ ص ۸۹

(۴۱) ،،سیدات بیت النبوۃ،،۔ ص ۹۰

(۴۲) ،،سیدات بیت النبوۃ،، مولفہ پروفیسر ڈاکٹر عائشہ بنت الشاطی، ص ۸۹۔

(۴۳) ،،الروض الانف،، مولفہ امام سہیلیؒ۔ الجزالاول۔ ص ۱۷۹ مکتبہ الکلیات الازھریہ، مصر۔

(۴۴) طبقات الکبیر جلد اول ص ۶۰ (ابن سعد) مطبوعہ E.J.BRILL (۱۹۱۷)

(X) مدت میں اختلاف ہے۔ مولف۔

(۴۵) ،،البدایہ والنہایہ،، جلد ۲ ص ۲۴۹ (علامہ ابن کثیرؒ)

(۴۶) ،،کتاب الشفا،، للقاضی عیاضؒ قد طبع مکتبہ نعیمیہ الکائن فی لاہور الجزالاول ص ۵۰۔

(ختم شد)

(ماخوذ از "ام رسول" مؤلفہ پیام شاہجہانپوری ص ص ۹۳ تا ۱۰۷ شائع کردہ ادارہ تاریخ و تحقیق این ۲۳۔ عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن، لاہور قیمت -/ ۸۰ روپے)

یادرفتگاں

حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کی یاد میں

از اعجاز احمد صاحب لیکچرار

یادرفتگان کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور جیسی شخصیت پر اتنے مختصر نوٹس پر تقریر تیار کرنا مشکل کام ہے۔ اور پھر ۳۰ منٹ میں سارا بیان مکمل کرنا اور بھی مشکل ہے۔ یہ بات محض رسماً یا تکلفاً نہیں کہہ رہا۔ بلکہ اس کے لیئے تقاریر کا ایک سلسلہ چاہیئے۔

وہ جو مسیح موعودؑ کا روحانی بیٹا تھا۔ جسے الہاماً عالم برزخ میں حضرت مسیح موعودؑ کہتے ہیں۔ "آپ بھی صالح تھے اور نیک ارادہ رکھتے تھے آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

ایک رویا میں حضرت مسیح موعودؑ کو ایک خود کار پن دیا جاتا ہے مگر آپ کہتے ہیں کہ یہ میں نے تو نہیں منگوایا۔ مولوی عبدالکریم صاحب نے رویا ہی میں کہا تو اچھا مولوی محمد علی صاحب نے منگوایا ہو گا۔ اس پر حضرت مرزا صاحب کی ایک اور رویا میں آپ کو "مجدالدین" کہا گیا۔ یعنی دین کی تمجید کرنے والا۔

ایک حدیث میں مہدی کو حارث یعنی زمیندار کہا گیا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مرزا صاحب نے اپنا ایک کشف بھی بیان کیا ہے۔ جو "ازالہ اوہام" میں یوں درج ہے:-

"اور اس کے (یعنی حارث کے) لشکر، اس کی جماعت کا سردار سرگروہ ایک توفیق یافتہ شخص ہو گا۔ جس کو آسمان پر منصور کے نام سے پکارا جائے گا کیونکہ خدا تعالیٰ اس کے خادمانہ ارادوں کا جو اس کے دل میں ہوں گے آپ ناصر ہو گا۔ اگرچہ اس منصور کو سپہ سالار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مقام میں در حقیقت کوئی ظاہری جنگ و جدل مراد نہیں۔ بلکہ یہ ایک روحانی فوج ہو گی کہ اس حارث کو دی جائے گی۔ جیسا کہ کشفی حالت میں اس عاجز نے دیکھا کہ انسان کی صورت پر دو شخص ایک مکان میں بیٹھے ہیں۔ ایک زمین پر اور ایک چھت کے قریب بیٹھا ہے۔ تب میں نے اس شخص کو جو زمین پر تھا مخاطب کر کے کہا کہ مجھے ایک لاکھ فوج کی ضرورت ہے۔ مگر وہ چپ رہا۔ اور اس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ تب میں نے اس دوسرے کی طرف رخ کیا، وہ چھت کے قریب اور آسمان کی طرف تھا۔ اس سے میں نے مخاطب کر کے کہا۔ مجھے ایک لاکھ فوج کی ضرورت ہے۔ وہ میری بات سن کر بولا۔ ایک لاکھ نہیں پانچ ہزار دیا جائے گا۔ تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگرچہ پانچ ہزار تھوڑے آدمی ہیں۔ پر خدا چاہے تو تھوڑے بہتوں پر فتح پا سکتے ہیں۔ اس وقت میں نے یہ آیت پڑھی كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ۔ پھر وہ منصور مجھے کشف کی حالت میں دکھایا گیا اور کہا گیا، خوشحال ہے خوشحال۔ مگر خدا تعالیٰ کی کسی حکمت خفیہ نے میری نظر کو اس کے پہچاننے سے قاصر رکھا۔ لیکن میں امید رکھتا ہوں کہ کسی دوسری وقت دکھایا جائے۔"

ازالہ اوہام ۱۸۹۱ میں لکھی گئی اس وقت حضرت مولانا کی عمر فقط ۱۷ سال تھی۔ آپ ابھی احمدی بھی نہ ہوئے تھے۔ یہاں پر ایک اور خدائی تصرف کی بات نظر آتی ہے کہ حضرت مولانا نے حضرت مرزا صاحب کی جو پہلی کتاب مطالعہ کی اور ساتھ ہی آپ کے بھائی اور والد بزرگوار نے بھی اور جس کے بعد احمدیت کی حقیقت اور سچائی کو قبول کیا، وہ یہی کتاب "ازالہ اوہام" تھی۔ بیعت تو آپ نے مارچ ۱۸۹۷ء میں کی۔

"براہین احمدیہ" جو کہ آپؑ کی پہلی کتاب ہے مختلف جلدوں میں چھپتی رہی۔ اس میں لکھا ہے کہ آپؑ کو عین بیداری کی حالت میں کشف ہوا جس میں آپؑ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور اہل بیت سے ملاقات ہوئی۔ اس کا اگلا حصہ اس طرح پر ہے:

" پھر بعد اس کے ایک کتاب مجھ کو دی گئی جس کی نسبت یہ بتلایا گیا کہ یہ تفسیر قرآن ہے۔ جس کو علی نے تالیف کرنا ہے اور اب علیؓ وہ تفسیر تجھ کو دیتا ہے۔" ۱۸۸۰ کی دہائی میں مختلف جلدیں چھپیں یہ تفسیر جو کہ آپؑ نے لکھنی تھی۔ پہلے ہی سے خدا تعالیٰ نے علی کے ذمہ ڈال دی۔ اور محمد علی نے وہ تفسیر لکھی اور آپؑ سے منسوب کی۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد علی صاحب انگریزی ترجمہ و تفسیر کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"اس تفسیر کی بہترین باتیں اس زمانے کے سب سے بڑے مذہبی راہنما حضرت مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے قلب سے میرے قلب میں آئی ہیں۔ میں نے سیر ہو کر علم کے اس چشمہ سے پانی پیا ہے جو اس مصلح عظیم، مہدی و مجدد صدی چہار دہم، بانی سلسلہ احمدیہ نے بہایا ہے۔"

میں دوبارہ "ازالہ اوہام" کی طرف آتا ہوں جو کہ ۱۸۹۱ء میں چھپی۔

حضرت مرزا صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں "سو میری صلاح ہے کہ بجائے ان واعظوں کے عمدہ عمدہ تالیفیں ان ملکوں میں بھیجی جائیں اور اگر قوم بدل و جان میری مدد میں مصروف ہو تو میں چاہتا ہوں کہ ایک تفسیر بھی تیار کر کے انگریزی میں ترجمہ کرا کر ان کے پاس بھیجی جائے۔ میں اس بات کو صاف صاف بیان کرنے سے نہیں رہ سکتا کہ یہ میرا کام ہے۔ دوسرے سے ہرگز نہیں ہو گا۔ جیسا مجھ سے یا اس سے جو میری شاخ ہے اور مجھ میں داخل ہے۔"

یہ دونوں حوالے حضرت مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کی بیعت سے پہلے کے ہیں۔

اب حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی حضرت مولانا محمد علی صاحب کے بارے میں مزید ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:

میں چاہتا ہوں کہ ایک کتاب تعلیم کی لکھوں اور مولوی محمد علی صاحب ترجمہ کریں۔۔۔۔"

اخبار "بدر" میں حضرت مسیح موعود کی ڈائری روزانہ روئیداد کی شکل میں شائع ہوتی تھی۔ ان کی زندگی میں ۱۳ فروری ۱۹۰۷ء کو مولوی محمد علی صاحب کو حضرت اقدس نے بلا کر فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ یورپ و امریکہ کے لوگوں پر تبلیغ کا حق ادا کرنے کے لیئے ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی جائے اور یہ آپ کا کام ہے۔۔۔ ان لوگوں کا حق ہے کہ ان کو حقیقی اسلام دکھایا جائے جو خدا تعالیٰ نے ہم پر ظاہر کیا ہے۔"

۱۸۹۱ء میں حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں کہ "یہ میرا کام ہے۔ دوسرے سے ہرگز نہیں ہو گا۔ جیسا مجھ سے یا اس سے جو میری شاخ ہے اور مجھ میں ہی داخل ہے۔"

اور ۱۹۰۷ء میں (۱۶ سال بعد) حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی وفات سے پہلے ہی اس بات کی وضاحت فرما دی۔ اور حضرت مولانا محمد علی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا" یہ آپ کا کام ہے۔"

اس طرح حضرت مولانا محمد علی صاحب کی زندگی حضرت مسیح موعودؑ کی زندگی کا ایک حصہ نظر آتی ہے اور یہی فنافی المامور کا مقام ہے۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے آپ کے اندرون اور بیرون کے مطالعہ کے بعد ایک اشتہار میں آپ کے متعلق یہ تحریر فرمایا:-

"اور میں اس مدت میں یعنی جب سے کہ وہ میرے پاس ہیں ظاہری نظر سے اور نیز پوشیدہ طور پر ان کے حالات، اخلاق، دین اور شرافت کی رو سے تجسس کرتا رہا ہوں۔ سو خدا کا شکر ہے کہ میں نے ان کو دینداری میں اور شرافت کے ہر پہلو میں نہایت عمدہ انسان پایا ہے۔ غریب طبع، باحیا، نیک اندرون، پرہیزگار آدمی ہے اور بہت سی خوبیوں میں رشک کے لائق ہے۔"

پھر ۱۸۹۹ء میں ایک اور اشتہار میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں "میری فراست اس بات میں خطا نہیں کرے گی کہ جوان موصوف خدا تعالیٰ کی راہ میں ترقی کرے گا اور یقین ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے تقوے اور محبت دین پر ثابت قدم رہ کر ایسے نمونے دکھائے گا کہ جو ہم جنسوں کے لیئے پیروی کے لائق ہوں گے۔ اے خدا تو ایسا ہی کر آمین! ثم آمین۔"

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی زندگی میں ہی بہت سے کام حضرت مولانا محمد علی صاحب کے ذمے لگا دیئے تھے۔ جن میں حضرت مرزا صاحب کی تحریرات کے اخبارات میں شائع ہونے سے قبل مطالعہ، حضرت مرزا صاحب کی غیر موجودگی میں مہمان خانہ کا انتظام اور رسالہ "ریویو آف ریلجنز" بھی حضرت مولانا کی ادارت میں شائع ہوتا۔ ان تیرہ سالوں میں اس رسالہ کی شہرت اور افادیت ہندوستان سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل گئی۔ اپنوں اور غیروں سب نے اس کی علمیت اور اعلیٰ معیار کی تعریف کی۔

اس وقت صرف چند حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

انگریزی ترجمۃ القرآن پر اخبار "یونائیٹڈ انڈیا"، دہلی نے لکھا

"نسل انسانی نے جواب تک تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے سرانجام دیتے ہیں۔ ان میں مولانا محمد علی کا انگریزی ترجمہ قرآن ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریا آبادی جو کہ خود بھی بعد میں ایک مفسر قرآن (انگریزی) بنے۔ انہوں نے اخبار "سچ" میں تحریر کیا: "مولانا محمد علی صاحب نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلام کی جو مہتم بالشان خدمت سرانجام دی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ اس ترجمہ کی بدولت نہ صرف ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام کی پناہ لی بلکہ ہزاروں مسلمان بھی اسلام کے زیادہ قریب آ گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نہایت مسرت سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو چودہ پندرہ سال پہلے جب میں ظلمتوں اور دہریت کی گہرائیوں میں بھٹک رہا تھا، میرے لیئے شمع ہدایت بن کر آئیں اور مجھے اسلام کا سیدھا رستہ سمجھایا۔"

حضرت مولانا کی معرکہ آرا کتاب "ریلیجن آف اسلام" جو ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی اس پر بھی ہر طرف سے نہایت شاندار تبصرے ہوئے۔

علامہ سر محمد اقبال نے کہا "نہایت مفید کتاب ہے اور مذہب اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیئے ازبس ضروری ہے۔"

محمد مارماڈیول پکتھال صاحب جنہوں نے بعد میں "قرآن کے پیغام" کے نام سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، رسالہ "اسلامک کلچر" میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "کسی زندہ انسان نے اسلام کی تجدید کے لیئے لاہور کے مولانا محمد علی سے زیادہ قیمتی اور طویل خدمات انجام نہیں دیں۔ یہ اسلام کی تصویر ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جو قرآن اور سنت سے خوب واقف ہے۔ جس کے دل میں اس کی نشاۃ ثانیہ کے لیئے ایک امید ہے جس کے آثار اب چاروں طرف نظر آنے لگے ہیں۔"

حضرت خواجہ کمال الدین صاحبؒ، بانی ووکنگ مسلم مشن، انگلستان جن کے متعلق حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو الہاماً "حسن بیان" کا لقب عطا ہوا۔ آپ کی تقاریر ہندو پاک اور یورپ میں نہایت ہی اثر انگیز ہوتی تھیں۔ حضرت خواجہ صاحب، حضرت مولانا کے متعلق فرماتے ہیں۔ "عام طور پر جب ایک خطیب یا مقرر ایک دو فقرے زبان سے نکالتا ہے تو میں اسی وقت سمجھ جاتا ہوں کہ اب آگے اس نے کیا کہنا ہے۔ اس لیئے میری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ مگر مولوی یعنی (مولوی محمد علی) جب ایک فقرہ کہتا ہے تو مجھے قطعاً پتہ نہیں لگتا کہ یہ آگے کیا کہے گا اور ہر نیا فقرہ نئی بات لے کر آتا ہے۔ اس لیئے میں شروع سے آخر تک توجہ سے سنتا ہوں۔" بے شک اس زمانے میں ہمارے بزرگوں میں نہایت صاحب فصاحت اور بلاغت مقرر موجود تھے لیکن حضرت مولانا کی سادگی بیان اور سادہ الفاظ میں جو تاثیر تھی وہ دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہ دراصل وہ سچی لگن وہ سچا جذبہ اور روحانیت تھی جو آپ نے حضرت مسیح موعودؑ کے چشمہ سے حاصل کی تھی۔

اب میں حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے مختلف خطابوں سے اقتباس پیش کرتا ہوں جو آپ نے جمعہ کے خطبوں یا مختلف جلسوں میں دیئے اور اخبارات میں شائع ہوئے۔

جون ۱۹۰۸ میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی وفات کے بعد لاہور کے یونیورسٹی ہال میں حضرت مرزا صاحب کی آخری کتاب "پیغام

صلح" کا پڑھا جانا تھا۔ کثرت سے احمدی احباب لاہور میں جمع ہو گئے تھے اس موقع پر حضرت مولانا نور الدین کے حکم پر حضرت مولانا نے تقریر کی۔

اقتباس ملاحظہ فرمایں: "کتنا بڑا اور عظیم الشان مقصد ہے جو آپ کے سامنے ہے، گویا ایک عظیم الشان پہاڑ آپ کے راستے میں ہے جسے اٹھا کر آپ نے راستہ صاف کرنا ہے۔ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانا آسان ہے مگر یہ کام اس سے بھی اہم تر ہے جو ہمارے امام نے ہمارے سپرد کیا ہے، اسلام کو دنیا میں پھیلانا۔ یہ کوئی چھوٹا سا کام نہیں ہے؟ یہ کوئی آسان بات ہے؟ مگر تسلی دینے والی جو بات ہے۔ وہ یہی ہے کہ خود خدا کا وعدہ ہے کہ میں اس جماعت کے ذریعے اسلام کو غلبہ دوں گا۔ بس گھبرانے اور بزدلی دکھانے کی کوئی بات نہیں۔ حضرت اقدس نے خود اپنی تحریروں میں لکھا ہے کہ خدا جانے میں نے کن دشوار گذار گھاٹیوں، خاردار بیابانوں اور سنسان جنگلات میں سے گذرنا ہے۔ پس جس کے پاؤں نازک ہیں اس کو چاہیئے کہ ابھی مجھ سے الگ ہو جائے۔ دوستو! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ مشکلات کی کٹھن گھاٹیاں اور خاردار جنگل اور ڈراؤنے بیابان ابھی ہمارے آگے ہیں۔ جن کو طے کر کے ہمیں اپنے امام پاک اور ہادی برحق کے بتاتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچنا ہے۔"

حضرت مولانا آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"باوجود مخالفت کی سخت آندھیوں کے وہ خدا کا مامور لاکھوں انسانوں کو اپنی بات منوا گیا۔ اور آپ لوگوں میں اپنی روح پیدا کر گیا اگر اس کو لے کر ہم یہ کام کریں تو روحانی فتوحات کے دروازے ہم پر کھولے جائیں گے۔"

حضرت مولانا محمد علی صاحب کو قرآن کو دنیا میں پہنچانے کا جنون تھا۔ ۱۹۴۶ء کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں۔

"آپؑ (یعنی مسیح موعود) کے زبردست اندرونی جذبات کا کوئی حصہ کسی نے لیا کوئی کسی نے۔ میرے مردہ دل کو آپ کا جذبہ تبلیغ زندہ کر گیا۔ یہ وہی آپ کے انوار قلب کی کوئی کرن ہے جو میرے دل پر نشان ڈال گئی۔ جس نے میرے اندر جذبہ پیدا کر دیا کہ قرآن کو دنیا میں پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ میرے دل کی آرزو ہے۔ نہیں، یہ میرا جنون ہے۔ اور گو بعض لوگ میرے اس جنون سے تنگ آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنون ابھی کمزور ہے۔ میں گو اپنے ہر خطبہ میں تبلیغ قرآن یا ترجمہ یا تعلیم قرآن پر عمل کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ مگر میں خود ایک کمزور آدمی ہوں اس لیئے میری بات کا اثر بھی کم ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے جس دن یہ جنون سب جماعت میں پیدا ہو گیا۔ اس دن ساری مسلمان قوم کے اندر نئی زندگی پیدا ہو جائے گی اور "غم اشاعت فرقان" جو مسیح موعود کے دل کو تڑپاتا تھا ساری قوم میں سرایت کر جائے گا۔ وہ دن اسلام کے غلبہ کا دن ہو گا۔"

۱۴ فروری ۱۹۵۱ء کی "پیغام صلح" میں شائع شدہ حضرت مولانا کے ایک خط کا اقتباس:

"نماز ایک دعا ہے۔ بارگاہ رب العالمین میں ایک سوال ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دلوں کی اصلاح فرمائے۔ اور اپنے قرآن اور محمدؐ کے ذریعے بندوں کی ربوبیت فرمائے۔ یہ درست ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح بھی نماز کی غرض ہے۔ یہ درست ہے کہ دعا اور چیزوں کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ مگر جس نے نماز اور دعا کو اس حد تک محدود کر دیا اور اس بلند غرض کو سامنے نہیں رکھا جو رسول اللہؐ کے سامنے تھی۔ اس نے رسول اکرم صلعم کو نہیں پہچانا اور وہ ایک ادنیٰ مقام پر راضی ہو گیا۔ اتنی بڑی بارگاہ سے کچھ مانگنے جاؤ تو سوال بھی بہت بڑا لے کر جاؤ کیونکہ وہ اس قدرت کا مالک ہے کہ وہ وہ چیز بھی تمہیں دے سکتا ہے جو تمہارے خیال میں ناممکن ہے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ نسل انسانی کو بچایا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ قرآن اور محمدؐ کے نور سے ساری دنیا روشن ہو جائے گی۔ اور اسلام دنیا پر غالب آ جائے گا۔ تم جس کو ناممکن سمجھتے ہو، تمہارا خدا کہتا ہے کہ وہ ہو کر رہے گا۔۔۔ ہاں جب تک ہمارے دلوں میں ویسی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ جو رسولؐ کے دل میں تھی۔

اپنی نماز کو رسول اکرم صلعم کی نماز بنانے کی کوشش کرو۔ مسجدوں میں نمازوں کے لیئے جاؤ اور با جماعت نماز پڑھو۔ مگر ہمارے

رسولؐ کا حکم ہے گھروں کو قبریں مت بناؤ۔ ایک حصہ نمازوں کا گھر پر بھی ادا کرو۔ جہاں مسجد میں امام کی آواز پر تم سجدے سے گرے ہوتے اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔ گھر کی نماز میں اس کے در پر اس طرح گرو کہ تمہارا سر نہ اٹھ سکے۔"

دسمبر ۵۰ء میں بیماری کے آخری زمانہ میں نہایت کمزور تھے۔ محترم نصیر احمد فاروقی صاحب ملنے گئے تو ان کو فرمایا: "اس وقت ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک چھوٹے بچے کی شکل میں ایک خوبصورت اور وجیہہ انسان کی گود میں ہوں اور مجھے تفہیم ہوتی ہے کہ وہ شخص خود اللہ تعالیٰ ہے۔ اس شخص نے مجھے اپنے سینے سے اس طرح چمٹالیا، جس طرح ماں وفور محبت سے بچے کو اپنے سینے سے لگالیتی ہے۔ تو مجھے بھی محبت نے اس قدر بے قرار کیا کہ میں نے اس شخص کی قمیض کے بٹن کھول کر (گویا قمیض درمیان میں حائل نہ رہی) دونوں باہیں ڈال کر اپنے آپ کو اس شخص سے چمٹالیا اور میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ مُحِبِّیْ فَاجْعَلْنِیْ مِنْ اَحِبَّائِکَ۔ اے اللہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پس تو مجھے اپنے سے محبت کرنے والا بنا۔"

آخر میں حضرت مولانا کی ایک دعا پیش کرتا ہوں۔ آپ سے گذارش ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کریں اور ہر موقع پر اونچی آواز میں آمین کہیں۔

"اے خدا تیرا دین نہایت بے کسی کی حالت میں ہے۔ دنیا تیری نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ سونے اور چاندی کے پہاڑ دنیا میں موجود ہیں۔ مگر اے مالک تیرے دین کو، ہاں اس دین کو، جس کے متعلق تو نے وعدہ فرمایا ہے کہ اسے سب ادیان پر غالب کروں گا۔ جس کے متعلق تیرا حکم تھا کہ اسے دنیا کے کناروں تک پہنچایا جائے۔ دنیا میں پہنچانے کے لیئے سامان نہیں ملتا۔ اے خدا! تثلیث اور کفارہ پھیلانے کے لیئے دنیا کا مال پانی کی طرح بہہ رہا ہے اور دنیا کی طاقت اس کی پشت پر ہے۔ مگر تیرا دین اس بے کسی کی حالت میں ہے کہ مسلمانوں کے دل بھی اس کے لیئے نرم نہیں ہوتے۔ تیرے پیغمبرؐ کے پروانے تو بہت ہیں۔ مگر اس کی محبت کی آگ میں اپنے آپ کو جلانے والے نظر نہیں آتے۔ اے خدا! تیرے مسیح نے ایک قوم تیار کی تھی کہ وہ تیرے دین کو دنیا میں پہنچاتے اور تیرے وعدوں کے پورا ہونے کا نظارہ دکھاتے۔ مگر آہ! وہ قوم بھی سیاست میں بہہ گئی اور ایک چھوٹا سا گروہ جو دنیا کی نظروں میں حقیر ہے، باقی رہ گیا ہے۔ مگر اے خدا وہ بھی کمزور ہے اور تیری امانت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اے خدا تو ان کے سینوں میں وہ درد اپنے دین کا پیدا کر دے جو تو نے اپنے پاک رسولؐ کے سینے میں پیدا کیا تھا اور اپنے دین کے غم میں ان کی وہ حالت کر دے جو تو نے اپنے پاک رسولؐ کی تھی۔ لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔ اے خدا تو ان کی دنیا کی محبت کو ٹھنڈا کر اور اپنی محبت کی ایسی آگ ان کے سینوں میں جلا کہ وہ سب خس و خاشاک کو جلا دے۔ اور اس کی حرارت سے مردہ دلوں کے اندر زندگی پیدا ہو جائے۔ اے خدا تو اپنی نصرتوں کی ہوائیں اس گروہ پر چلا اور اپنے فضلوں کی بارش ان پر برسا اور اپنی رحمتوں کے دروازے ان پر کھول دے۔ اے خدا تو اس گروہ کو توفیق دے کہ تیرے کلام کو دنیا کے کناروں تک پہنچا دے۔ اے خدا تو ہماری زندگیوں میں یہ نظارہ دکھا کہ دجال کی مملکت میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوں اور مسجدیں بن جائیں اور تیرا نام فضا میں گونجنے لگ جائے۔ اے خدا ہمیں وہ نظارہ دکھا جو تو نے اپنے رسولؐ اور اس کے سچے نام لیواؤں کو دکھایا کہ ان ہاتھوں پر فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوتے۔"

آمین۔ ثم آمین۔

نقد و نظر

جنوبی افریقہ کے مقدمات کے بارے میں غلط بیانیاں

ڈاکٹر زاہد عزیز، ایڈیٹر "لائٹ" ۔ لندن

ترجمان القرآن

جنوبی افریقہ :- قادیانیت کے بارے میں عدالت عالیہ کا فیصلہ

پروفیسر خورشید احمد و ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی

"پاکستان میں قومی اسمبلی اور سینیٹ نے ۱۹۷۴ میں ایک تاریخی دستوری ترمیم کے ذریعہ جو متفقہ طور پر منظور ہوئی، مرزا غلام احمد قادیانی کے تمام پیروؤں کو خواہ ان کا تعلق احمدی قادیانی گروہ سے ہو یا احمدی لاہوری گروہ سے اسلام کے دائرہ سے خارج اور ایک مستقل بذات مذہب قرار دیا۔ اس ترمیم کے نتیجہ میں "مسلمان" کی ایک ایسی واضح اور دستوری تعریف متعین ہو گئی جس کی روشنی میں ساری دنیا میں مسلمان اور قادیانی دو الگ امتیں قرار پائے۔ امت مسلمہ کے اس اجتماعی فیصلہ کو ساری دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کی۔ اس طرح ایک ایسے فتنہ کی صحیح پوزیشن کا تعین ہو گیا جو ایک صدی سے امت مسلمہ کو برطانوی سامراج کی اسکیم کے تحت منتشر کرنے اور اس کے عقیدہ اور عمل میں دراڑیں ڈالنے میں مصروف تھا۔

پاکستان اور عالم اسلام میں اس ہزیمت کے بعد قادیانی گروہ نے اپنی سرگرمیاں امریکہ، یورپ اور افریقہ کے ان ممالک میں تیز تر کر دیں جہاں عیسائی یا سیکولر حکومتیں ان کو تحفظ فراہم کر رہی تھیں۔ جنوبی افریقہ میں احمدیوں نے مسلمانوں کو چیلنج کیا اور کیپ ٹاؤن کی عدالت عالیہ میں اپنا یہ "حق" منوانے کی کوشش کی کہ ان کو "مسلمان" تسلیم کیا جائے اور مسلمانوں کی مساجد میں عبادت اور ان کے قبرستانوں میں دفن ہونے کا "حق" دلوایا جائے۔ یہ مقدمہ ۱۹۸۲ء میں دائر کیا گیا اور اس کا آخری فیصلہ اب اگست ۱۹۹۵ء میں ہوا ہے۔ الحمد للہ جنوبی افریقہ کی اعلیٰ ترین عدالت کے فل بینچ نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون مسلمان نہیں، اس امر کا فیصلہ کرنے کے مجاز خود مسلمان اور ان کے اعلیٰ ترین دینی اور قانونی ادارے ہیں اور ایک سیکولر حکومت کو اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے جو مسلمان خود طے کرتے ہیں اور ان پر اپنی کسی تعبیر کو مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

کیپ ٹاؤن میں احمدیوں کی ایک نہایت قلیل تعداد مقیم ہے۔ اس گروہ کے چند افراد نے پہلے تو زبردستی وہاں کی مساجد میں داخل ہونے کی کوشش کی جسے مسلمان کمیونٹی نے سخت ناپسند کیا۔ پھر انہوں نے کیپ ٹاؤن کی عدالت عالیہ میں ایک مقدمہ مسلم جوڈیشل کونسل (MJC)، جس نے احمدیوں کے غیر مسلم ہونے کا اعلان کیا تھا اور جس میں کیپ ٹاؤن کی تمام ہی مساجد کے امام اور دوسرے علماء شریک ہیں، کے خلاف دائر کرایا، اور بنیادی حقوق کا سہارا لے کر مطالبہ کیا کہ عدالت ان کو مساجد میں داخلہ مدارس سے استفادہ اور مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کے حقوق دلائے۔ مقدمہ نے صرف جنوبی افریقہ ہی نہیں پورے براعظم افریقہ میں اہمیت اختیار کر لی۔ جنوبی افریقہ کی تمام مسلمان تنظیموں نے ہر اختلاف سے صرف نظر کر کے اس مقدمہ میں مسلمانوں کے موقف کو یک جان اور یک زبان ہو کر پیش کیا اور عالم اسلام سے بھی مدد کی درخواست کی۔ جامع الازھر نے ایک خاص "فتویٰ" جاری کیا اور پاکستان نے ایک وفد مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم کی قیادت میں بھیجا جس نے مسلم جوڈیشل کونسل کی مدد کی۔ جنوبی افریقہ کے مشہور وکیل اسماعیل محمد اور اٹارنی احمد چوہان نے بڑی قابلیت کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی۔ پاکستان کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے ڈاکٹر

محمود احمد غازی نے بطور گواہ اور علمی معاون کے دو ہفتے سے زیادہ عدالت کے سامنے مسلمانوں کا موقف پیش کیا۔ جسٹس محمد افضل چیمہ، جسٹس محمد تقی عثمانی، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، ڈاکٹر حبیب الحق ندوی اور تحریک ختم نبوت کے علما نے ہر ممکن معاونت کی۔ مجھے بھی اس مقدمہ کے سلسلہ میں دو بار شریک عدالت ہونے کا موقع ملا۔

کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں مقدمہ کی سماعت دو محور پر گردش کرتی رہی۔ اول یہ کہ آیا احمدی اور لاہوری مسلم ہیں یا مرتد! دوسرے یہ کہ آیا سیکولر عدالت کو کسی مذہبی کمیونٹی کے عقائد کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جج برمن (Berman) نے بڑی جسارت کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ سیکولر (secular) عدالت قطعی مجاز ہے کہ وہ مذہبی عقائد سے متعلق مسائل میں بھی اپنے فیصلے صادر کرے، بلکہ ان معاملات میں سیکولر عدالت زیادہ باصلاحیت (competent) ہے، کیونکہ اس کا فیصلہ خالص انصاف پر مبنی ہوگا اور غیر جانبدارانہ بھی۔ ایم۔ جے۔ سی نے عدالت کے فیصلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مقدمہ کو مشترک عدالت سے خارج کرنے کی درخواست کی۔ مقدمہ کی سماعت ثانیہ نومبر ۱۹۸۵ء میں شروع ہوئی۔ ۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو جج ولیم نے فیصلہ صادر کر دیا کہ احمدی لاہوری چونکہ مسلمان ہیں، لہذا ان کے مسلم حقوق بحال کیے جائیں، مساجد میں داخلہ اور قبرستان میں تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے۔

مسلمانوں نے عدالت کے فیصلہ کو مسترد کر دیا اور اعلان کر دیا کہ لاہوری احمدی بھی قادیانیوں کی طرح غیر مسلم تھے۔ ایک کافر جج دوسرے کافر کو مسلم قرار نہیں دے سکتا ہے۔ ایم۔ جے۔ سی نے تمام مساجد کے ائمہ اور اراکین کمیٹی کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ کسی بھی قادیانی احمدی لاہوری یا ان کے حمایتی اور طرفداروں کو مساجد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں اور مسلم قبرستان میں ان کی تدفین کی مزاحمت کریں۔ یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ ہر مسلمان عدالت کی حکم عدولی کی سزا بھگتنے اور جیل جانے کے لیے تیار رہے۔ جج ولیم کے فیصلہ کی روشنی میں قادیانی اور "لاہوری احمدی" جسارت کے ساتھ مساجد میں داخل ہونے لگے۔ اس سے فرقہ وارانہ کشمکش میں اضافہ ہوا اور تصادم کے خطرات بڑھنے لگے۔ مساجد اور مقابر میں ان کی مداخلت سے شہر میں فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

مسلم جوڈیشیل کونسل نے ملک کی سب سے بڑی عدالت میں جج برمن اور ولیم کے فیصلوں کے خلاف اپیل دائر کی۔ یہ مقدمہ (Case No.201/1992) عدالت عالیہ کے بینچ میں پانچ عالی ججوں کے سامنے پیش ہوا اور اس کی سماعت ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۲۸ اور ۱۹ اگست ۱۹۹۵ کو جاری رہی۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ کو ججوں نے ۱۷ صفحات پر مشتمل اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور صفحات ۵۴ اور ۱۵۵ پر سابق ججوں کے فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:

کسی کمیونٹی کے مذہبی عقائد کے بارے میں فیصلہ خود اس کمیونٹی کے علما اور ماہرین عقائد ہی، جو اس عقیدہ کے محافظ، امین اور مجاور ہیں کر سکتے ہیں۔ صرف انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ صادر کریں کہ کس فرد کے عقائد، مذہب کے تسلیم شدہ عقائد کے مطابق ہیں اور کس فرد کے عقائد اس کے مخالف ہیں۔ اس حق کو کوئی عدالت یا فرقہ سلب نہیں کر سکتا۔ سیکولر یا دنیاوی عدالت کے لیے غیر موزوں ہے کہ وہ فیصلہ صادر کر دے کہ کون مسلمان ہے اور کون مرتد ہے۔ کسی فرد کو مذہب کے دائرہ سے خارج (Excommunicate) کرنے کا حق بھی علما ہی کو حاصل ہے۔

جنوبی افریقہ کی عدالت عالیہ کا یہ فیصلہ اب ایک عالمی نظیر (Precedent) ہے۔ دنیا کی کسی عدالت میں قادیانی فرقہ یا احمدی اور لاہوری فرقہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ کوئی سیکولر عدالت ان فرقوں کو حق تحفظ دینے کی اہل نہیں۔ ان کے بارے میں حتمی فیصلہ امت مسلمہ کے علماء اور مذہب کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ انہیں غیر مسلم یا مرتد قرار دے چکے ہیں تو کوئی سیکولر عدالت انہیں مسلم قرار نہیں دے سکتی ہے۔ قادیانی جو عام طور پر سیکولر عدالتوں کا سہارا لے کر اپنے حقوق کا تحفظ حاصل کیا کرتے تھے، اب وہ اس

فیصلہ کن نظیر کی روشنی میں اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ قادیانی تحریک اب جنوبی افریقہ میں درگور ہو چکی ہے۔ تحریک ارتداد کے کفن میں یہ فیصلہ آخری کیل تھی۔"

(ترجمان القرآن، لاہور جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب

پاکستان کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے شمارے بابت جنوری ۱۹۹۶ء میں صفحات ۵۷ تا ۵۹ پر ایک مضمون بعنوان:-

"جنوبی افریقہ" : قادیانیت کے بارے میں عدالت عالیہ کا فیصلہ" پروفیسر خورشید احمد اور ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی کے قلم سے شائع ہوا ہے جس میں جنوبی افریقہ کے عدالتی مقدمہ نمبر 201/92 کے اپیل کے فیصلہ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء پر تبصرہ کیا گیا ہے جو کہ صریح غلط بیانیوں پر مشتمل ہے۔

اس مضمون میں دو بنیادی غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ اول، یہ کہ اس اپیل کو ایک پہلے مقدمہ سے، جو ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۵ء ہوا، ملا کر اس کی اپیل بتایا گیا ہے۔ اس طرح دو مختلف مقدموں کے کوائف کو آپس میں بالکل گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ دوم، یہ کہ اپیل کے فیصلہ کو غلط بیان کیا ہے، اس حد تک کہ جو اصل فیصلہ ہے اس کا تو ذکر تک نہیں، اور جو فیصلہ تھا ہی نہیں اس کو بطور اپیل کا فیصلہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون کا یہ بیان بالکل اور قطعاً غلط ہے کہ عدالت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ "کون مسلمان ہے اور کون مسلمان نہیں، اس امر کا فیصلہ کرنے کے مجاز خود مسلمان اور ان کے اعلیٰ ترین دینی اور قانونی ادارے ہیں اور ایک سیکولر حکومت کو اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے جو مسلمان خود طے کرتے ہیں۔"

اس مضمون کے اصل مصنف پروفیسر خورشید احمد ہی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ایک مقام پر ڈاکٹر حبیب الحق ندوی کا نام لے کر ذکر کر کے آگے لکھا ہے:- "مجھے بھی اس مقدمہ کے سلسلہ میں دو بار شریک عدالت ہونے کا موقع ملا" جس سے ظاہر ہے کہ یہ الفاظ لکھنے والے پروفیسر خورشید احمد ہی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد کے اس اقرار سے کہ آپ ذاتی طور پر اس مقدمہ سے منسلک رہے ہیں، ہم حیران ہیں کہ پھر اتنی شدید غلط بیانیوں کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ لاعلمی تو وجہ نہیں ہو سکتی ہے۔

اس اپیل کے فیصلہ کے متعلق خاکسار ایک مضمون لکھ چکا ہے جو ہمارے نئے انگریزی رسالہ "بشارات احمدیہ"، مورخہ دسمبر ۱۹۹۵ء میں امریکہ سے شائع ہو چکا ہے، جس میں تمام مقدمہ کا پس منظر اور اپیل کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ میرے موجودہ مضمون کا مقصد "ترجمان القرآن" کے مقالہ کی غلط بیانیوں کو درست کرنا ہے۔

اس مقدمہ کو ۸۵-۱۹۸۲ والے مقدمہ سے ملانے کی غلط بیانی

مضمون نگار لکھتے ہیں:- "جنوبی افریقہ میں احمدیوں نے مسلمانوں کو چیلنج کیا اور کیپ ٹاؤن کی عدالت عالیہ میں اپنا یہ حق منوانے کی کوشش کی کہ ان کو مسلمان تسلیم کیا جائے اور مسلمانوں کی مساجد میں عبادت اور ان کے قبرستانوں میں دفن کا حق دلوایا جائے۔ یہ مقدمہ ۱۹۸۲ء میں دائر کیا گیا اور اس کا آخری فیصلہ اب اگست ۱۹۹۵ء میں ہوا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۸۲ء میں دائر کیا ہوا مقدمہ تو نومبر ۱۹۸۵ء میں ختم ہو گیا جس کا فیصلہ جج Williamson نے یہ دیا کہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور (کیپ ٹاؤن شاخ) کے ممبر مسلمان ہیں اور اس بنا پر عدالت نے یہ حکم جاری کیے کہ ان کے متعلق شائع کرنا کہ وہ کافر، مرتد وغیرہ ہیں، ممنوع ہے اور انہیں مساجد میں داخلہ یا مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے نہیں روکا جا سکتا۔

اس مقدمہ میں مدعی جماعت احمدیہ لاہور (کیپ ٹاؤن) کے ایک فرد اسماعیل پیک (Peck) تھے اور انہوں نے یہ مقدمہ مخالف علماء کی تنظیم یعنی مسلم جوڈیشل کونسل (MJC) وغیرہ پر دائر کیا تھا۔ مخالفین یعنی MJC وغیرہ، جن کے خلاف یہ فیصلہ دیا گیا، انہوں نے اس کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی اور اس طرح یہ مقدمہ نومبر ۱۹۸۵ء میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

جس مقدمہ کی اپیل کا فیصلہ حال ہی میں ستمبر ۱۹۹۵ میں ہوا، وہ تو ایک علیحدہ مقدمہ ہے جو ۱۹۸۶ میں شروع ہوا۔ یہ مقدمہ شیخ جسیم (Jassiem) نے، جو کہ ایک سنی امام تھے اور کسی زمانہ میں خود بھی MJC میں شامل رہ چکے تھے، انہوں نے MJC کے صدر شیخ ناظم اور MJC پر دائر کیا تھا۔ مقدمہ کی وجہ یہ تھی کہ شیخ ناظم نے ایک اجتماع میں شیخ جسیم کو "احمدیوں کا حمایتی" کا خطاب دیا تھا جو کہ اس مجمع میں "کافر" اور "مرتد" کہنے کا ہم معنی تھا۔ شیخ جسیم نے ہتک عزت (Defamation) کا مقدمہ کر دیا، اس دعویٰ کے ساتھ کہ میں تو احمدیوں کو مسلمان سمجھنے میں اسلام کے مطابق درست ہوں، اس لیئے مجھے عوام کے سامنے کافر اور مرتد قرار دینا میری ہتک عزت ہے۔

اس مقدمہ کی تو ایک طویل داستان ہے، لیکن قصہ مختصر یہ کہ ۱۹۹۰ء میں عدالت نے شیخ جسیم کے حق میں شیخ ناظم اور MJC دونوں کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ شیخ ناظم اور MJC نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی، اور یہ اپیل ہے جس کا فیصلہ حال میں ہوا ہے۔

اپیل کا اصل فیصلہ

جنوبی افریقہ کی عدالت عالیہ کے فیصلہ کے متعلق غلط بیانیوں کی مزید تفصیلات دینے سے پہلے ہم اپیل کا اصل فیصلہ بیان کر دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ اپیل کرنے والے دو فریق تھے، یعنی شیخ ناظم صدر MJC اور خود MJC ۔ فیصلہ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ یہ تھا کہ شیخ ناظم کی اپیل ناکام ہو گئی، یعنی نچلی عدالت کا فیصلہ برقرار رہا کہ شیخ جسیم کو کافر اور مرتد کہنا ان کی ہتک عزت ہے۔ MJC کی اپیل کی جتنی بنیادیں تھیں وہ سوائے ایک کے باقی تمام کو اپیل کورٹ نے مسترد کر دیا، مگر MJC کی ایک دلیل کو قبول کر لیا کہ یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ MJC نے شیخ ناظم کو اختیار یا ہدایت دی تھی کہ وہ شیخ جسیم کو کافر اور مرتد قرار دے۔ عدالت نے اس بات کو قبول کر لیا کہ شیخ ناظم نے یہ حرکت MJC کی پالیسی کی تعمیل میں نہیں کی تھی، نہ بحیثیت MJC کے صدر ہونے سے۔ اس طرح اپیل کورٹ نے نچلی عدالت کا MJC کے خلاف ہتک عزت کا فیصلہ مسترد کر دیا۔ مگر کسی دینی مسئلہ میں اپیل کرنے والوں کی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

مضمون نگار نے اس اپیل کو ۸۵-۱۹۸۲ کے کیس سے ملا کر بہت سے کوائف کو غلط بیان کیا ہے، جس کی چند مثالیں ہم پیش کرتے ہیں۔

مضمون نگار ۸۵-۱۹۸۲ والے کیس کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں:- "جنوبی افریقہ کے مشہور وکیل اسماعیل محمد اور اٹارنی احمد چوہان نے بڑی قابلیت کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی۔ پاکستان کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بطور گواہ اور علمی معاون کے دو ہفتے سے زیادہ عدالت کے سامنے مسلمانوں کا موقف پیش کیا۔"

اسماعیل محمد تو MJC کے وکیل ۸۵-۱۹۸۲ کیس میں تھے، اور ڈاکٹر غازی تو گواہ دوسرے کیس یعنی شیخ جسیم کے کیس میں تھے۔ پروفیسر خورشید احمد تو خود دوسرے کیس کی سماعت کے دوران عدالت میں موجود تھے۔ کیا انہیں نظر نہ آیا کہ MJC کا ایڈووکیٹ اسماعیل محمد نہیں بلکہ ایک سفید فام، یہودی بنام Hoberman ہے؟ ہم Hoberman کے یہودی ہونے کا ذکر صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ جب احمدیوں نے ۸۵-۱۹۸۲ والا کیس جیتا تو پاکستان سے جن علماء نے MJC کی مدد کی تھی انہوں نے اخباری بیانات میں کہا کہ احمدی اس لیئے جیتے ہیں کیونکہ جج یہودی تھا اور احمدی اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ یہ اشارہ ایک جج Berman کی طرف تھا جو اس کیس کے ایک درمیانی مرحلہ پر جج تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا پروفیسر صاحب یا غازی صاحب یہ اعلان کرنے کو تیار ہیں کہ انہوں نے ایک یہودی ایڈووکیٹ کی مدد سے مقدمہ میں اپنا موقف پیش کیا؟

اپیل کے فیصلہ کے متعلق غلط بیانیاں

مضمون نگار نے ۸۵-۱۹۸۲ کے مقدمہ کے فیصلوں کا ذکر کرتے ہوتے لکھا ہے:-

" MJC نے ملک کی سب سے بڑی عدالت میں جج Berman اور Williamson کے فیصلوں کے خلاف اپیل دائر کی۔ یہ مقدمہ Case No.201/1992 عدالت عالیہ کے بینچ میں پانچ عالی ججوں کے سامنے پیش ہوا۔۔۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ کو ججوں نے ۱۷۱ صفحات پر مشتمل اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔۔۔۔"

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ اپیل Berman اور Williamson کے علی الترتیب ۱۹۸۴ اور ۱۹۸۵ کے فیصلوں کے خلاف نہیں تھی۔ یہ تو شیخ جسیم کے مقدمہ کے فیصلہ مورخہ ۱۹۹۰ کے خلاف تھی۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب تو خود جسیم مقدمہ کی سماعت کے دوران ۱۹۸۷ میں عدالت میں موجود تھے کیا انہیں معلوم نہ ہوا کہ مقدمہ کس جھگڑے کے متعلق ہے، جس کے لیئے وہ پاکستان سے خاص طور پر ہزارہا میلوں کا سفر کر کے گئے ہیں؟ اگر پروفیسر صاحب بھول گئے تھے تو ذرا اپیل کے فیصلہ کے پہلے دو صفحے ہی دیکھ لیتے جہاں صاف لکھا ہے کہ یہ اپیل ہتک عزت (Defamation) کے فیصلہ کے خلاف ہے جو نچلی عدالت نے شیخ جسیم کے حق میں، شیخ ناظم اور MJC کے خلاف دیا۔

اپیل کے فیصلہ کے متعلق پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:-

" ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء کو ججوں نے ۱۷۱ صفحات پر مشتمل اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور صفحات ۱۵۴ اور ۱۵۵ پر سابق ججوں کے فیصلوں کو مسترد کرتے ہوتے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ کسی کمیونٹی کے مذہبی عقائد کے بارے میں فیصلہ خود اس کمیونٹی کے علماء اور ماہرین عقائد ہی۔۔۔ کر سکتے ہیں۔ صرف انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ صادر کریں کہ کس فرد کے عقائد مذہب کے تسلیم شدہ عقاید کے مطابق ہیں اور کس فرد کے عقاید اس کے مخالف ہیں۔ اس حق کو کوئی عدالت یا فرقہ سلب نہیں کر سکتا۔۔۔۔ کسی فرد کو مذہب کے دائرہ سے خارج کرنے کا حق بھی علماء ہی کو حاصل ہے۔"

اگر عدالت کا یہی فیصلہ ہوتا تو پھر اسی عدالت نے شیخ ناظم صدر MJC کی اپیل کو مسترد کر کے نچلی عدالت کے اس فیصلہ کو برقرار کیوں رکھا کہ شیخ ناظم نے شیخ جسیم کو مرتد کہہ کر اس کی ہتک عزت کی ہے؟ جس امر کا اپیل پر فیصلہ ہونا تھا اس پر تو ججوں نے صاف صاف نچلی عدالت کے فیصلہ کو قبول کیا کہ جسیم کی ہتک عزت ہوئی ہے۔

پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر اپیل کا یہی فیصلہ تھا جو مذکورہ مضمون میں پیش کیا گیا ہے تو عدالت نے MJC کی اپیل کو اس بنا پر کیوں منظور کر لیا کہ MJC کے خلاف یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ شیخ ناظم نے شیخ جسیم کو مرتد MJC کی ہدایت کے مطابق کہا تھا۔ اگر عدالت کے نزدیک MJC کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی فرد کو مرتد قرار دے کر اسلام سے خارج کر دے، تو پھر MJC کا محض اس بنا پر بچنا کہ انہوں نے شیخ ناظم کو ایسی ہدایت نہیں دی تھی ایک بے معنی بات ہے۔

اپیل کے فیصلہ کی پیش کردہ عبارت کا تجزیہ

اب ہم فیصلہ کی اس عبارت کا تجزیہ کرتے ہیں جس کے حوالہ سے (یعنی صفحات ۱۵۵-۱۵۴) یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سابق ججوں کے فیصلوں کو مسترد کر دیا گیا ہے اور علماء کا حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ کسی شخص کو مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج کر سکتے ہیں۔

اپیل کے فیصلہ کے شروع میں، ہی ججوں نے ۸۵-۱۹۸۲ کے مقدمہ کا مختصراً خاکہ دیا ہے اور جج Berman اور ۱۹۸۴ کے اس فیصلہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک سیکولر عدالت یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہے کہ احمدی مسلمان ہیں یا نہیں۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

" جیسا کہ ہمارے فیصلہ میں آگے چل کر ظاہر ہو جاتے گا، اس اپیل کا فیصلہ کرنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ یہ عدالت اس نکتہ نظر (یعنی Berman کے فیصلہ) کے متعلق فیصلہ دے کہ آیا یہ قابل قبول ہے یا قابل عمل ہے۔" (صفحہ ۳۱)

یعنی اپیل کورٹ تو کہتی ہے کہ ہم Berman کے فیصلہ کے متعلق اپنا کوئی فیصلہ نہیں دے رہے، اور مذکورہ مضمون میں تمام پروپیگنڈا ہی یہ ہے کہ اپیل کورٹ نے Berman کے فیصلہ کو مسترد کر دیا۔

اپیل کورٹ کے فیصلہ میں جو عبارت صفحات ۱۵۵-۱۵۴ پر

موجود ہے، جس کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اس کا سیاق و سباق دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہاں جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان سے گواہ محمود احمد غازی صاحب نے اور خود شیخ ناظم نے بھی اپنی گواہی میں نچلی عدالت کو بتایا تھا کہ کسی شخص کو مرتد قرار دینے کے لئے ایک باقاعدہ طریقہ کار یا Procedures ہوتا ہے جس پر چلنا ضروری ہوتا ہے (دیکھو صفحات ۱۵۳ ـ ۱۵۱)۔ اس کے متعلق اپیل کورٹ ذیل کا تبصرہ کرتی ہے:-

"اگر، جیسا کہ اپیل کرنے والوں کا دعویٰ ہے، اور اس دعویٰ پر ہم کوئی رائے نہیں دے رہے، یہ طریقہ کار (Procedures) واقعی دین اسلام کا حصہ ہیں، تو ہمارا مقام نہیں کہ ان کی (یعنی ان procedures کی) معقولیت پر یا ان کے انصاف کے مطابق ہونے پر کوئی رائے دیں۔" (صفحات ۱۵۴ ـ ۱۵۳)

آگے چل کر جو فیصلہ میں لکھا ہے وہ اس مفروضہ کی بنا پر ہے، یعنی یہ فرض کر کے کہ اگر اپیل کرنے والوں کا دعویٰ واقعی درست ہے کہ اسلام میں کسی کو مرتد قرار دینے کے کوئی Procedures موجود ہیں۔ مگر یہاں عدالت نے صاف لکھا ہے کہ ہم اس بات کے درست یا غلط ہونے پر کوئی رائے نہیں دے رہے۔ لیکن اس امر کو درست فرض کرتے ہوئے اپیل کورٹ نے لکھا ہے:-

"جن کو درحقیقت یہ فرض سونپا گیا ہے کہ وہ عقائد اسلام کی حفاظت کریں، ہم ان کے اس حق کا انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے دین کے بنیادی عقائد کی حفاظت کرنے کی کوشش کریں، اور کسی ایسے شخص کو دین سے خارج کر دیں جس کے عقائد ان اصولوں کے خلاف ہیں یا مطابق نہیں۔ اس لیئے ہمارے لیئے غیر موزوں ہو گا کہ ہم مروجہ قانونی معیاروں کے مطابق یہ ماپیں کہ کسی ایسے شخص کو مرتد قرار دینا انصاف ہے یا درست ہے جو احمدیوں کے بارہ میں غیر جانبدار رہتا ہے، کیونکہ وہ ان کے عقائد کے متعلق کم علم رکھتا ہے یا کیونکہ وہ یہ مانتا ہے کہ قرآن مجید کے مطابق جو بھی فرد ظاہر میں مسلمان لگے اسے مسجد میں داخلہ سے نہیں روکا جا سکتا۔"

یہ وہ عبارت ہے جس کی بنیاد پر پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ اس فیصلہ میں عدالت نے علماء کا حق تسلیم کر لیا ہے کہ وہ جس فرد کو چاہیں اسے مرتد قرار دے سکتے ہیں، اور عدالت کے لئے غیر موزوں ہے کہ اس معاملہ میں ان کی تردید کرے۔ مگر یہ نظریہ نہ تو اس عدالت کے فیصلہ کا کوئی جزو ہے اور نہ ہی عدالت نے اس کو بطور اصول پیش کر کے اس پر عمل کیا ہے۔ یہ محض اس فرض کی بنا پر ہے جس کا ذکر اس سے فوراً پہلے فیصلہ میں کیا گیا۔

مذکورہ مضمون نگار کی تشریح اس سے بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے جو کہ فیصلہ میں مندرجہ بالا عبارت کے فوراً بعد لکھا ہے۔ جج صاحبان لکھتے ہیں:-

"آیا جسیم کا ان وجوہات کی بنا پر احمدیوں کو کافر قرار دینے سے انکار کرنے پر اسے مرتد کا لقب دینا جائز ہوتا، اس سوال کا جواب ہمیں نہیں دینا پڑتا ان نتائج کی وجہ سے جو کہ ہم نے اس کیس کے دیگر پہلوؤں سے نکال لیئے ہیں۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ ہم پر ہرگز یہ واضح نہیں ہوا کہ اس بنا پر اسے یہ لقب دینا (یعنی مرتد) جائز ہوتا۔ اتنی بات ہی کافی ہے کہ تمام فریق یہ قبول کرتے ہیں کہ دین اسلام کے طریق کار پر، جو کہ ایسے شخص سے متعلق ہیں جس پر احمدی یا احمدیوں کا حمایتی ہونے کا شبہ ہو، جسیم کی نسبت ان پر ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ سے پہلے عمل نہیں کیا گیا تھا۔" (صفحات ۱۵۶ ـ ۱۵۵)

(نوٹ:- ۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ وہ تاریخ ہے جب شیخ ناظم نے شیخ جسیم کو مجمع میں مرتد کا خطاب دیا تھا۔)

ان الفاظ سے مضمون نگار کے موقف کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ عدالت کہتی ہے کہ جو Procedures بقول MJC کے، اسلام نے ان افراد کی نسبت مقرر کیئے ہیں جن پر مرتد ہونے کا الزام لگے (یعنی انکوائری ہو اور ملزم اس کے سامنے اپنے "غلط" عقائد پر اصرار کرتا رہے)، اور جن Procedures کے متعلق MJC کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ ان پر چلتے ہیں، ان پر عمل درآمد ہونے سے پیشتر ہی شیخ ناظم نے شیخ جسیم کو پبلک میں مرتد کہا۔ اس لیئے اس بنا پر ہی شیخ جسیم کا ہتک عزت کا دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے۔

اس وجہ سے، جیسا کہ فیصلہ کے مندرجہ بالا الفاظ میں لکھا ہے،

عدالت کو اس سوال میں جانا ہی نہ پڑا کہ آیا شیخ جسیم کو اس بنا پر مرتد قرار دینا کہ وہ احمدیوں کو مسلمان سمجھتا ہے جائز ہے یا نہیں۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ضرورت ہو تو عدالت اس سوال میں جا سکتی ہے، بلکہ عدالت نے تو اس کے متعلق اپنا تاثر بھی دے دیا اپنے ان الفاظ میں کہ "لیکن ہم یہ کہیں گے کہ ہم پر ہرگز یہ واضح نہیں ہوا کہ اس بنا پر اسے یہ لقب دینا (یعنی مرتد) جائز ہوتا۔"

مندرجہ بالا عبارت کے بعد فیصلہ میں عدالت نے لکھا ہے کہ شیخ ناظم نے "جھوٹی گواہی" (False Evidence) دی کہ اس نے ذاتی طور پر ان Procedures پر عمل کرنے کے بعد ہی شیخ جسیم کو مرتد کہا تھا (صفحہ ۱۵۶)۔ آگے چل کر صفحہ ۱۶۰ پر پھر ذکر ہے کہ "ناظم نے مقدمہ میں جھوٹی گواہی دی اس کوشش میں کہ اس کا رد عمل اسلامی طریقہ کار کے مطابق معلوم ہو"۔ یعنی جس فریق کی حمایت پروفیسر خورشید احمد کر رہے ہیں اس کے متعلق اپیل کے فیصلہ میں لکھا ہے کہ اس نے جھوٹی گواہی دی۔ اسی طرح MJC کے متعلق ایک مقام پر لکھا ہے:-

"جسیم نے اپنی گواہی میں کئی مرتبہ دعویٰ کیا کہ وہ مزید گواہ نہیں پیش کر سکا کیونکہ لوگ اس کی تائید میں بولنے سے ڈرتے تھے۔ جب دیکھا جائے کہ MJC شیخی مارتے ہیں کہ وہ کسی ملزم کی تائید کرنے والے کو بھی مجرم قرار دیتے ہیں، اور MJC والے اپنی اطاعت کرنے کی پرزور تلقین کرتے ہیں، اور بہت سے دیگر امور جو ریکارڈ میں آتے ہیں، تو جسیم کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے۔ اور اس دعویٰ کی تردید نہیں بلکہ اس کی تصدیق ہوتی ہے ان دو گواہوں سے جن کو ناظم اپنی طرف سے پیش کر سکا۔ ان گواہوں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ جبری گواہی دے رہے ہیں (Giving evidence under orders)، مگر خلاف قانون جھوٹ (Perjury) کی حد تک پہنچنے سے گریز کرتے ہیں۔" (صفحات ۱۱۳-۱۱۲)

یہ ہے عدالت کی رائے ان فریقین کے متعلق جن کی تائید پروفیسر صاحب کر رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب کا اس مقدمہ میں اپنا رد عمل

پروفیسر خورشید احمد، یہ تو لکھتے ہیں کہ "مجھے بھی اس مقدمہ کے سلسلہ میں دو بار شریک عدالت ہونے کا موقع ملا"، مگر اس "شریک عدالت" ہونے کی کوئی مزید تفصیل نہیں بتاتے۔ اس کے متعلق ہم قارئین کو بعض دلچسپ واقعات سے آگاہ کرتے ہیں۔ جب اگست تا دسمبر ۱۹۸۷ میں شیخ جسیم کے مقدمہ کی سماعت میں پہلے تو محترم حافظ شیر محمد صاحب مرحوم نے جسیم کی طرف سے، اور پھر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے فریق مخالف کی طرف سے، گواہی دے دی تو فریق مخالف کی طرف سے عدالت کو کہا گیا کہ اب پروفیسر خورشید احمد گواہی دیں گے جس میں وہ عالم اسلام کے فتاویٰ پیش کریں گے کہ تمام مسلمان احمدیوں کو غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی عدالت کو یہ بھی کہا گیا کہ کیونکہ پروفیسر صاحب کو اپنی گواہی کی تیاری کے لیئے کافی وقت چاہیئے اس لیئے مقدمہ کو اگلے سال تک ملتوی کر دیا جائے۔ لہٰذا عدالت نے سماعت کو فروری ۱۹۸۸ کے اخیر تک ملتوی کر دیا۔ جب سماعت دوبارہ شروع ہوئی، تو پروفیسر خورشید احمد صاحب کا نام و نشان بھی موجود نہ تھا! اب پروفیسر صاحب ذرا بتائیں کہ انہوں نے گواہی دینے سے یہ راہ گریز کیوں اختیار کی؟

حرف آخر

آخر میں ہم دوبارہ مذکورہ مضمون کے مندرجات اور بیانات کی قطعی تردید کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ اس اپیل کے فیصلہ نے گزشتہ فیصلوں کو مسترد کر دیا ہے جن کے مطابق جماعت احمدیہ لاہور (کیپ ٹاؤن) کے افراد مسلمان ہیں، اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ اس فیصلہ کی رو سے کسی علماء کی تنظیم کا حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ جس کو چاہیں دائرہ اسلام سے خارج کر دیں، اور سیکولر عدالتوں کو ان کا فتویٰ قبول کرنا پڑے گا۔

تبصرہ

قادیانی مسئلہ اور لاہوری گروپ کی حیثیت (۹)

ختم نبوت اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ ۔۳

بشارت احمد بقا

یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ غازی صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مان کر بھی حضرت مسیح ابن مریم کے اس امت میں نزول ثانی کے قائل ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رَسُولًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْل قرار دیا اور انہیں انجیل جیسی کتاب ہدایت عطا فرمائی۔ ان کے نزدیک ایسے کامل صاحب کتاب اور مستقل نبی کی آمد سے آنحضرت صلعم کی ختم نبوت کی مہر نہیں ٹوٹتی اور نہ ہی عقیدہ ختم نبوت کی نفی ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی محدثِ امت مجازی، لغوی، ظلی اور بروزی طور پر مشکوۃ نبوت محمدیہؐ کے نور سے منور ہو کر نبی کہلائے تو اس سے آیت قرآنی مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تکذیب لازم ہو جاتی ہے اور مسلمانوں کے عقیدہ ختم نبوت کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اسے کہتے ہیں۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

یہ سب غلط فہمی دراصل محدث اللہ کے مقام اور منصب کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اس کے مقام کو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے یوں بیان فرمایا ہے۔

"تحدیث محض ایک موہبت ہے۔۔۔۔ محدث اسی طرح بھیجے جاتے ہیں جس طرح نبی بھیجے جاتے ہیں اور محدث اسی چشمہ سے پیتے ہیں جس سے نبی پیتے ہیں اور کچھ شک نہیں کہ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو وہ نبی ہو جاتا۔" (حمامتہ البشری عربی ص ۸۲)

"اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوتا تو ہر ایک محدث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہو جانے کی رکھتا تھا اور اسی قوت اور استعداد کے لحاظ سے محدث کا حمل نبی پر جائز ہے یعنی کہہ سکتے ہیں کہ المحدث نبی۔" (آئینہ کمالات اسلام ص ۲۳۹)

یہی موقف حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی علیہ الرحمتہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزمان، غوث قطب لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحب وحی دونوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ارباب شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے مصرح حکم نہیں ملتا تو اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعے خود خدا تعالیٰ سے لیتے ہیں۔۔۔۔ اس طور پر مادہ کشف و الہام اور مادہ وحی رسول ایک ہے۔۔۔۔۔ صاحب کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقہ سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے۔۔۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہؐ کا لینا ہے۔"

(فصوص الحکم منقول در کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" منصفہ غلام احمد پرویز مرحوم ص ص ۷۶، ۷۷)۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی شان یون بیان فرمائی ہے۔

"الحمد للہ والسلام علی عبدہ الذین اصطفیٰ میں اللہ تعالیٰ کا مرید بھی ہوں اور مراد بھی۔ میری ارادت کا سلسلہ بغیر کسی واسطہ کے اللہ سے متصل ہے اور میرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا قائمقام ہے۔ سبحانہ پس میں محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مرید بھی ہوں اور اس کا

پیر بھائی بھی ہوں۔ اس دولت کے دستر خوان پر میں اگرچہ ہر چند طفیلی ہوں مگر بغیر بلانے کے نہیں گیا اور ہر چند کہ میں تابع ہوں لیکن اصلیت سے بے بہرہ نہیں ہوں اور ہر چند کہ میں اس کا امتی ہوں تاہم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک دولت بھی ہوں لیکن ایسا شریک نہیں کہ ہمسری کا دعویٰ کروں کیونکہ یہ کفر ہے۔"

(مکتوبات ربانی جلد ۳ مکتوب ۱۲۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کی کوئی ولی اللہ تو جرات نہیں کر سکتا اور نہ آج تک کسی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ ہر کسی نے آنحضور صلعم کی غلامی کو اپنی نجات کا ذریعہ یقین کیا ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے تو بلکہ یہ نعرہ بلند کیا

بعد از خدا بعشق محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

اور پھر اپنے اشعار میں اپنے آقا و مولے صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعریف کی:

برتر گمان و وہم سے احمدؐ کی شان ہے
جس کا غلام دیکھو مسیح زمان ہے

کرامت گرچہ بے نام و نشاں است
بیابنگر ز غلمان محمدؐ

دل میں یہی ہے ہر دم تیرا صحیفہ چوموں
قرآن کے گرد گھوموں کعبہ میرا یہی ہے

اس نور پہ فدا ہوں اس کا ہی میں ہوا ہوں
وہ ہے میں چیز کیا ہوں بس فیصلہ یہی ہے

ایں چشمۂ رواں کہ بخلق خدا دہم
یک قطرہ ز بحر کمال محمدؐ است

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث کا غازی صاحب نے حوالہ دیا ہے اس سے قرآن شریف کی آیت استخلاف کی ہی تفسیر ہوتی ہے۔ پہلی امتوں میں جس قدر خلفاء گذرے وہ تمام کے تمام ہی انبیاء تھے حتیٰ کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے سلیمان علیہ السلام نبی تھے اور ظاہری بادشاہ بھی۔ خدا تعالیٰ نے امت محمدیہ کے لئے بھی جن خلفاء کا وعدہ دیا ہے وہ بھی ایسے ہی برگزیدہ انسان ہیں اور گذشتہ چودہ صدیوں میں ایسے ہی مبعوث ہوتے رہے جیسے انبیاء علیہم السلام۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ نے فرمایا۔

"اے فرزند ایں آن وقتے است کہ در امم سابقہ دریں طور وقتیکہ پر ظلمت است پیغمبرے اولو العزم مبعوث میگشت و احیاء شریعت جدید می کرد و دریں امت کہ خیر الامم است و پیغمبر ایشاں خاتم الرسل علیہ علی آلہ الصلوۃ والتسلیمات علماء را مرتبہ انبیاء بنی اسرائیل دادہ اند وبوجود علماء از وجود انبیاء کفایت فرمودہ اند۔ لہذہ برسر ہرمائۃ از علماء ایں امت مجددے تعین می نمائند کہ احیاء شریعت فرمائند" (مکتوبات ربانی جلد اول مکتوب ۲۳۴)

اس سلسلہ میں حضرت شاہ اسمعیل شہید رحمتہ اللہ فرماتے ہیں۔

"اور بہتیرے ایسے مزکی اور مصفےٰ ہوں گے کہ ان کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مشابہت ہوگی اور رسالت کا ظل ہوں گے جس موقعہ سے انبیاء لوگ علوم غیبیہ اخذ کرتے تھے اسی جگہ سے یہ لوگ بھی حاصل کریں گے اس واسطے یہ لوگ انبیاء کے استاد بھائی کہلاتے ہیں۔ الغرض یہ لوگ اس درجہ کے ہوتے ہیں کہ اگر نبی کا ہونا ختم نہ ہوتا تو منصب نبوت پر یہ لوگ قائم ہوتے۔ حاصل کلام ایسے لوگ قیامت تک ہوا کریں گے۔" (صراط مستقیم تمہید ص ۱)

مگر غازی صاحب ایسے بزرگوں کا ظلی، جزوی، بروزی اور لغوی معنوں میں بھی نبی کہلانا کفر خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ سابقہ امتوں کے محدثین بروئے حدیث نبویؐ نبی کہلاتے۔ اس لحاظ سے تو امت محمدیہ کی بجائے وہ امتیں خیر امت کہلانے کی زیادہ حقدار ٹھرتی ہیں لیکن ہمارے بزرگوں نے اس قسم کی نبوت کو امت محمدیہ میں جاری و ساری مانا ہے۔ حالانکہ وہ تمام کے تمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بدل و جان تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت سید عبدالقادر جیلانی علیہ رحمتہ کے بارے میں لکھا ہے۔

(۱) "شیخ عبدالقادر جیلانی فرمایا کرتے تھے کہ انبیاء کو نبوت کا نام دیا گیا ہے اور ہمیں نبوت کا لقب دیا گیا ہے یعنی ہم پر نبی کا نام

ترک کر دیا گیا ہے ساتھ اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کلام اور اپنے رسولؐ کے کلام کے معانی سے خبر دیتا ہے اور اس مقام والوں کو انبیاء الاولیاء کا نام دیا گیا ہے۔ پس ان کی نبوت کی غائت یہ ہے کہ وہ احکام شریعت سمجھیں یہاں تک کہ اس میں خطا نہ ہو اس کے سوائے کچھ نہیں۔"

(۲) شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

"جو نبوت اور رسالت شریعت والی ہوتی ہے وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہے پس آپؐ کے بعد شریعت والا نبی کوئی نہیں آ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی کر کے ان میں نبوت عامہ جس میں شریعت نہ ہو باقی رہنے دی ہے" (من حکمۃ قدریہ)۔

قارئین غور فرمائیں۔ حضرت عبدالقادر گیلانیؒ نے اولیاء کے لئے نبی کا لقب امت میں باقی تسلیم فرمایا ہے اور جو علماء ربانی احکام شریعت کے بارے میں تفہیم براہ راست خدا تعالیٰ سے حاصل کرتے ہیں انہیں انبیاء الاولیاء کا نام دیا ہے۔ حضرت شیخ اکبر نے نبوت عامہ کو امت میں جاری و ساری تسلیم کیا ہے اور حضرت عبدالقادر گیلانیؒ کے محولہ بالا قول کی تصدیق یہ فرمائی ہے۔

"شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس جگہ انبیاء سے انبیاء الاولیاء مراد لی ہے۔ جو نبوت عامہ کے اہل ہیں۔" (فتوحات مکیہ)

(۳) حضرت امام الشعرانیؒ فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو عالم رویا میں دودھ کی صورت میں پایا اس لئے اس کے ساتھ آپؐ کی رویا کی تاویل کی جاتی ہے اور یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اجزائے نبوت میں امت پر باقی رکھا ہے۔ بس مطلق نبوت نہیں اٹھائی گئی اور صرف شریعت والی نبوت اٹھائی گئی ہے جیسا کہ اس کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ جس نے قرآن کو محفوظ کیا۔ نبوت اس کے دونوں پہلوؤں میں داخل کر دی گئی پس بلاشبہ اس کے ساتھ نبوت قائم ہو گئی۔"

(الیواقیت والجواہر ص ۴۲)

گویا امام ممدوح نے نبوت تشریعی کو ختم اور نبوت مطلق کو امت میں باقی مانا ہے۔

(۴) صاحب تفسیر روح المعانی ارشاد فرماتے ہیں۔

"نبوت دو طرح کی ہے۔ ایک نبوت عامہ اور دوسری نبوت خاصہ۔ وہ نبوت جس میں ہمارے لیئے کوئی ذوق اور حصہ نہیں وہ نبوت خاصہ ہے یعنی نبوت تشریعی۔ رہی نبوت عامہ" وہ اکابر رجال امت میں جاری و ساری ہے اور دنیا و آخرت میں غیر منقطع ہے"۔

(۵) حضرت مولانا روم علیہ الرحمتہ اپنی مثنوی کے دفتر پنجم میں فرماتے ہیں۔

چوں بدادی دست در دست پیر
بہر حکمت کو علیم است و خبیر
او نبیّ وقت خویش است اے مرید
زانکہ زو نور نبی آید پدید
مکر کن در کار نیکو خدمتے
تا نبوت یابی اندر امتے

صاحب "بحرالعلوم" ان اشعار کی یوں شرح کرتے ہیں۔

"مکر سے مراد تدبیر ہے اور نبوت سے مراد مرتبہ ارشاد ہے اور اس نبوت کو اولیاء پہنچتے ہیں۔ اور ان کو الانبیاء الاولیاء کہتے ہیں۔ اور ان الانبیاء الاولیاء کے لیئے لازم ہے کہ وہ نبی متبوع کے تابع ہوتے ہیں اور اس مقام کو نبوت مطلق کہا جاتا ہے۔ پس قول "تا نبوت یابی اندر امتے" کے معنی یہ ہیں کہ تا مقام نبوت مطلق امت میں قائم رہے اور اس مقام کے امت میں ہونے اور اس کے متبع رسول اور شرع محمدؐ ہونے کے باعث حق تعالیٰ سے ان پر خبریں پہنچتی ہیں۔" (بحرالعلوم دفتر پنجم)

مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم جو تحریک حصول پاکستان میں بہت بڑے مرد مجاہد تھے اور جو حضرت قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمتہ کے ہمیشہ دست راست رہے نے شیخ اکبر کے قول کی یوں تشریح فرمائی۔

"شیخ اکبر (محی الدین ابن عربی۔ ناقل) نے اپنی خاص اصطلاح

میں ولایت اور محدثیت کو نبوت غیر تشریعی کے الفاظ سے تعبیر کیا
ہے۔" (الشہاب ص ۸)

اس ضمن میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا یہ ارشاد بھی
خاص توجہ کا مستحق ہے۔

"پس معلوم ہوا کہ جس وحی کو شیخ باقی اور عام کہہ رہے ہیں وہ
بمعنی الہام ہے جو اولیاء اللہ کو ہوتا ہے۔ شیخ اپنی خاص اصطلاح میں
اس کو وحی کہتے ہیں اور یہ اصطلاح لغت کے مطابق ہے اور قرآن
مجید میں بھی وارد ہے۔ لقولہ تعالیٰ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ
وَقَوْلُہٗ تَعَالٰی اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی چنانچہ اگر مطلق نبوت
وحی نبوت کی دلیل ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بالاجماع نبی
ہوتیں پس منکرین نبوت ام موسیٰ وحی کی تفسیر الہام ہی سے کرتے
ہیں اسی طرح جس نبوت یا رسالت کو عام کہتے ہیں وہ بھی بمعنی لغوی
ہے یعنی اخبار و تبلیغ نہ بمعنی حقیقی جس کو شیخ نبوت تشریع تعبیر
کرتے ہیں۔" (التنبیہ الطربی ص ۹۹)

اب ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کا
عقیدہ بھی ان کی اپنی تحریرات سے پیش کر دیں جن سے اظہر من
الشمس ہو جاتا ہے کہ آپ بھی حضرت شیخ اکبر اور دوسرے علماء ربانی
کے ہی ہم خیال تھے اور آپ نے بھی صرف اس نبوت کو امت میں
جاری مانا ہے جو خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
حضورؐ کی کامل اتباع اور کامل پیروی کے طفیل اس امت میں
قیامت تک جاری رکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

(۱) " مَا نَعْنِیْ مِنَ النُّبُوَّۃِ مَا یُعْنٰی فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی میری
مراد اپنی نبوت سے وہ نبوت نہیں جو گذشتہ صحائف میں مراد لی گئی
ہے۔" (حقیقۃ الوحی الاستفتاء ص ۱۶، ۱۹۰۷ء)

(۲) " فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ
اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ یعنی نبوت کے انواع میں سے صرف ایک نوع باقی رہ
گئی ہے اور وہ مبشرات ہیں۔ پس دیکھ لے اے تنقید کرنے والے
فہیم کہ کیا باب نبوت کلی وجہ پر بند کیا گیا ہے۔ بلکہ حدیث دلالت
کرتی ہے اس بات پر کہ نبوت تامہ جو وحی نبوت کی حامل ہوتی تھی
وہ منقطع ہو چکی ہے لیکن وہ نبوت جس میں سوائے مبشرات کے کچھ
نہیں وہ قیامت کے دن تک باقی ہے۔ ہماری کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ
نبوت جزوی کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں اور اس نوع میں
کچھ نہیں سوائے مبشرات کے اور منذرات کے جو غیبی امور میں سے
ہوں۔" (توضیح مرام ص ۱۵۔ ۱۸۹۱ء)

(۳) " اس بات کو بحضور دل یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ نبوت جس کا
ہمیشہ کے لئے سلسلہ جاری رہے گا نبوت تامہ نہیں بلکہ جیسا کہ میں
ابھی بیان کر چکا ہوں وہ صرف ایک جزئی نبوت ہے جو دوسرے
لفظوں میں محدثیت کے اسم سے موسوم ہے۔" (ایضاً ص ۱۰)

(۴) " یہ الفاظ بطور استعارہ ہیں جیسا کہ حدیث میں بھی مسیح موعود
کے لئے نبی کا لفظ آیا ہے ظاہر ہے کہ جس کو خدا بھیجتا ہے وہ اس کا
فرستادہ ہوتا ہے اور فرستادہ کو عربی میں رسول کہتے ہیں اور جو غیب
کی خبر خدا سے پا کر دیوے اس کو عربی میں نبی کہتے ہیں۔ اسلامی
اصطلاح کے معنے الگ ہیں۔ اس جگہ محض لغوی معنی مراد ہیں۔"

(اربعین جلد دوم ص ۱۸ حاشیہ۔ ۱۹۰۰ء)

(۵) اند کہ ذکر در بارہ عقاید ما

ما مسلمانیم۔ بکتاب الٰہی قرآن شریف ایمان می آریم کہ سیدنا
محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبی خدا و رسول خدا است و دین او بہتر
از ادیان است و ایمان می آریم کہ او خاتم الانبیاء است بعد او
پیغمبرے نیست مگر آنکہ از فیض او پرورش یافتہ باشد و موافق وعدہ او
ظاہر شد و خدا را مکالمات و مخاطبات است با اولیائے خود دریں امت و
ایشاں را رنگ انبیاء دادہ می شود و در حقیقت انبیاء نیستند زیرا کہ
قرآن حاجت شریعت را بکمال رسانیدہ است و دادہ می شوند مگر فہم
قرآن و نہ زیادہ می کنند و نہ کم می کنند از اں قرآن و ہر کہ زیادہ کرد و
کم کرد پس او از شیطاناں است کہ بدکار اند و از ختم نبوت مراد ما ختم
کمالات نبوت است بر رسول ما صلی اللہ علیہ وسلم و او از ہماں
پیغمبراں افضل است و اعتقاد می داریم کہ بعد از وہیچ پیغمبرے
نیست مگر آنکہ از امت او باشد و از روحانیت او فیض یافتہ باشد۔ پس در
ہمچنیں نبوت وجود غیری نیست و نہ مقام غیرت است"۔

(مواہب الرحمن ص ص ۶۶، ۶۷۔ ۱۹۰۳ء)

(۶) "ہر ایک کامل جو اس امت کے لئے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے پرورش یافتہ ہے اور اس کی وحی محمدی وحی کی ظل ہے یہی ایک نکتہ ہے جو سمجھنے کے لائق ہے۔"

(تذکرۃ الشہادتین ص ۱۴۔ ۱۹۰۳ء)

(۷) "اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں نہ ہوتا اور آپ کی پیروی نہ کرتا تو اگر دنیا کے تمام پہاڑوں کے برابر میرے اعمال ہوتے تو پھر بھی میں کبھی یہ شرف مکالمہ مخاطبہ ہرگز نہ پاتا۔ کیونکہ اب بجز محمدی نبوت کے سب نبوتیں بند ہیں۔ شریعت والا نبی کوئی نہیں آسکتا اور بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے مگر وہی جو پہلے امتی ہو۔ اور میری نبوت یعنی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظل ہے۔"

(تجلیات الٰہیہ ص ۲۴، ۲۵۔ ۱۹۰۶ء)

یہاں غازی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات کے وسوسہ کا ازالہ کرنے کی غرض سے حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی یہ تحریر پیش کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔

"اس جگہ یہ سوال طبعاً ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی امت میں بہت سے نبی گذرے ہیں پس اس حالت میں موسیٰؑ کا افضل ہونا لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس قدر نبی گذرے ہیں ان سب کو خدا نے براہ راست چن لیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ لیکن اس امت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی برکت سے ہزار ہا اولیاء ہوتے ہیں اور ایک وہ بھی ہوا جو امتی بھی ہے اور نبی بھی۔ اس کثرت فیضان کی کسی نبی میں نظیر نہیں مل سکتی۔ اسرائیلی نبیوں کو الگ کر کے باقی تمام لوگ اکثر موسوی امت میں ناقص پائے جاتے ہیں۔ رہے انبیاء سو ہم بیان کر چکے ہیں کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کچھ نہیں پایا۔ بلکہ وہ براہ راست نبی کئے گئے مگر امت محمدیہ میں ہزارہا لوگ محض پیروی کی وجہ سے ولی کئے گئے۔"

(یہاں یہ تخصیص محض اس لیئے لی گئی ہے کیونکہ مسیح محمدی کے لئے زبان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نبی کا لفظ نکلا ہے۔ یعنی مسیح محمدی کو نبی کا نام پانے کے لئے ساری امت میں مخصوص کیا گیا ہے۔ ناقل)

(۸) "خدا تعالیٰ کو اپنا حقیقی محبوب قرار دے کر اس کی پرستش کرنا یہی ولائیت ہے جس کے آگے کوئی درجہ نہیں مگر یہ درجہ بغیر اس کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا؟" (حقیقۃ الوحی ص ۵۲۔ ۱۹۰۷ء)

الغرض حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے امت محمدیہ کے لیئے روحانیت کا آخری درجہ صاف طور پر ولائیت کا بیان فرمایا ہے جس کے آگے کوئی درجہ نہیں آپ نے وحی ولائت پانے کا ہی دعویٰ کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص وحی نبوت کی بجائے وحی ولائیت پاتا ہے وہ لامحالہ ولائت کا ہی درجہ رکھتا ہے اور اگر ظلی مجازی اور لغوی طور پر نبی کہلاتا ہے تو اس سے وہ مستلزم کفر نہیں پڑتا بلکہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت کا پتہ چلتا ہے اس قسم کی نبوت کا امت محمدیہ میں جاری و ساری رہنا تمام اہل اللہ اور علماء ربانی نے تسلیم کیا ہے۔

اب ہم آخر میں نبی کی وہ امتیازی خصوصیات جو اسے غیر نبی ولی اللہ پر حاصل ہیں ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ امید ہے ان کے مطالعہ سے قارئین کے اذہان ہر قسم کے ابہام سے صاف ہو جائیں گے اور انہیں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے مقام اور منصب کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

نبی کی امتیازی خصوصیات

(۱) ہر حقیقی نبی پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی نبوت نازل ہوتی ہے۔ جو حضرت جبرائیل لاتے ہیں۔ غیر نبی پر وحی ولائت نازل ہوتی ہے۔ جس کا دوسرا نام الہام ہے۔

(۲) نبی اپنی وحی کی پیروی کرتا ہے مگر غیر نبی اپنے نبی متبوع کی پیروی کرتا اور اپنے الہام کو اپنے نبی کے فرمودہ کے ماتحت رکھتا ہے۔

(۳) نبی کی وحی پہلی وحی کی مصدق ہوتی ہے مگر غیر نبی کی وحی خود محتاج تصدیق ہوا کرتی ہے۔

(۴) نبی اپنی وحی کے مطابق اپنی امت کو علم دین سکھاتا ہے۔ مگر غیر نبی امور دین میں اجتہاد سے کام لیتا ہے۔

(۵) نبی مطاع ہوتا ہے اور غیر نبی اپنے متبوع نبی کا مطیع ہوتا ہے۔

(۶) نبی اپنی وحی تمام و کمال اپنی امت کو پہنچاتا ہے۔ وحی کا کوئی حصہ بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن ایک غیر نبی اپنے الہامات تمام و کمال شائع کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔

(۷) نبی کی وحی گذشتہ شریعت اور کتاب میں ترمیم اور تنسیخ کر سکتی ہے۔ مگر غیر نبی کو یہ اختیار ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔

(۸) نبی کی وحی تکمیل ہدایت کرتی ہے اور یہ ہدایت قرآن شریف کی صورت میں کامل ہو چکی ہے امتی کی وحی صرف خادم قرآن شریف اور فرمودات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی ہے۔

(۹) نبی کی وحی متلو ہوتی ہے اور عبادات میں لازماً پڑھی جاتی ہے۔ مگر غیر نبی کی وحی غیر متلو ہوتی ہے اور عبادات میں ہرگز نہیں پڑھی جاتی۔

(۱۰) نبی کی وحی پر ایمان لانا اصول دین میں داخل ہے اور اس کا منکر حقیقی کافر اور راندہ درگاہ الہٰی ہوتا ہے مگر غیر نبی کی وحی کو یہ مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوتا اور اس کا منکر کافر دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں پاتا۔

(۱۱) ہر نبی اپنی نبوت اور رسالت کا اقرار ہر شخص سے لیتا ہے۔ مجرد توحید باری تعالیٰ پر ایمان لانے سے کوئی شخص ایماندار یا مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ اس کے ساتھ نبی کی رسالت پر ایمان لانا بھی بنیادی فرض ہوتا ہے۔ مگر ایک غیر نبی تو اپنی ولایت کا بھی اقرار اپنے مرید سے نہیں لیتا۔

(۱۲) ہر نبی کی اپنی امت ہوتی ہے۔ مگر غیر نبی خود اپنے نبی متبوع کا امتی ہوتا ہے۔

(۱۳) ہر نبی اپنی پہلی وحی سے ہی نبوت و رسالت کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے خواہ اس کی وحی میں اس کے نبی یا رسول ہونے کا ذکر بھی نہ ہو اور وہ اپنے نبی ہونے کا اظہار کرنے کا پابند ہوتا۔

اس کے بالمقابل ایک ظلی، بروزی اور مجازی نبی کثرت الہام کا محتاج ہوتا ہے اور کثرت الہامات ولایت کا خلاصہ ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بعض امور نبی اور غیر مامور میں مشترک پائے جاتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) جس طرح نبوت موہبت ہے اسی طرح محدثیت بھی موہبت ہے یعنی جس طرح انبیاء دنیا میں بھیجے جاتے ہیں اسی طرح محدثین بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے صریح وحی ولایت کے ذریعے مامور کئے جاتے ہیں۔

(۲) دونوں کی وحی کو دخل شیطانی سے منزہ رکھا جاتا ہے

(۳) جس طرح ایک نبی کا فرض ہے کہ حق تعالیٰ سے وحی نبوت پا کر اپنی نبوت کا اعلان کرے اسی طرح ایک محدث پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

(۴) جس طرح ایک نبی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے علم لدنی حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح سے یہ دولت خدا تعالیٰ سے ہر محدث و مجدد کو بھی ملتی ہے۔

(۵) جس طرح سے نبی کو غیب کا علم بذریعہ وحی ملتا ہے اسی طرح سے غیب مصفّٰی کی خبر محدث کو ملتی ہے۔

(۶) جس طرح سے ایک نبی اپنی وحی کو برحق یقین کرتا ہے۔ اسی طرح سے ایک محدث کو اپنے الہام پر یقین تام ہوتا ہے۔

(۷) جو سلوک خدا تعالیٰ ایک نبی سے کرتا ہے وہی سلوک ایک محدث سے بھی کرتا ہے۔

اخبار کا تراشہ

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے فارسی اور عربی نعتیہ کلام کا تذکرہ

"برصغیر کا ایک بے مثال نعت گو"

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پرواز

برصغیر ہندو پاک میں کوئی ہی ایسا شاعر رہا ہو گا جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان میں نعت نہ کہی ہو۔ نعت گوئی کی روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حسان بن ثابتؓ سے شروع ہوئی اور بے شمار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس بابرکت روایت کو آگے بڑھایا۔ عربی اور فارسی کے زیر اثر یہی روایت ہمارے ہاں بھی پہنچی اور شعراء کرام ہر دور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہدیہ عقیدت پیش کرتے اور اپنی عاقبت سنوارتے رہے۔

پنجاب یونیورسٹی سے دو حضرات نے نعت گوئی پر مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے اردو نعت گوئی پر اور ڈاکٹر اسحاق قریشی نے برصغیر میں عربی نعت گوئی پر مقالے لکھے۔ اگر برصغیر کی فارسی نعت پر کوئی مقالہ لکھا گیا ہے تو اس تک میری رسائی نہیں ہوئی۔ اتفاق سے یہ دونوں حضرات میرے رفیق کار رہے۔ ڈاکٹر اسحاق قریشی کا مقالہ میرے ملاحظہ میں آیا تو میں نے انہیں انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے نعت گو کا دیوان دیا۔ حیرت کی بات تھی کہ ڈاکٹر اسحاق قریشی نے اس شخص کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ میں نے توجہ دلائی تو فرمانے لگے کہ میرے علم میں ہی نہیں تھا کہ ان صاحب نے عربی میں نعتیں لکھی ہیں۔ مقالہ چھپنے کو تھا آپ نے وعدہ تو کیا تھا کہ چھپنے سے قبل وہ اس کی تلافی کر دیں گے۔ اب کچھ عرصہ سے میں تو یہاں اپسالا یونیورسٹی میں بیٹھا ہوں خدا معلوم ڈاکٹر صاحب نے اس کی تلافی کی یا نہیں؟

ہمارے ہاں انیسویں صدی کے اواختر تک بلکہ بیسویں صدی کی پہلے تین دہائیوں تک فارسی شعری روایت سے ہمارا رابطہ قائم تھا۔ اقبال اس فارسی شعری روایت کا آخری شاعر تھا۔ اس کے بعد یہ روایت مٹتے مٹتے مٹ گئی۔ کہیں کہیں اکا دکا شاعر، فارسی کو ذریعہ اظہار بناتے رہے مگر انیسویں صدی میں تو اکثر شاعر دقیق مضامین کے اظہار کے لیئے فارسی کو ترجیح دیتے تھے۔ جس فارسی نعت گو کا ذکر میں کرنے لگا ہوں ان کی نعت گوئی کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ وہ نعت کو ایک فکری نظم جان کر کہتے تھے محض مدینہ اور خاک مدینہ تک اپنے کو محدود نہیں رکھتے تھے۔ ان کے ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات مبارک کے صحیح مقام کا ادراک کیئے بغیر نعت کہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ان کی اکثر نعتیں فارسی یا عربی میں ہیں۔ ان کی عربی نعت۔

یا عین فیض اللہ والعرفان۔ یسعی الیک الخلق کالظمان!

(کہ اے فیضان و عرفان الٰہی کے سرچشمے ! خلق خدا تمہاری طرف پیاسوں کی طرح دوڑی آتی ہے)۔

بلاد عربیہ، میں بھی بہت احترام سے سنی اور پڑھی جاتی ہے۔ بلکہ دمشق کے ایک مدرسہ میں اس کا باقاعدہ درس دیا جاتا ہے۔ اس

ساری نعت میں کہیں ایک جگہ بھی اس بات کا ذکر نہیں کہ یہ نظم کس ذات مبارک کے بارے میں ہے۔ اس کے مطالب خود بتاتے چلے جاتے ہیں کہ وہ سرچشمہ عرفان کون ہے جس کی جانب دنیا پیاسوں کی طرح سعی کرتی چلی آتی ہے۔ یہ نعت داخلی شہادت کے پیرائے میں کہی گئی ہے اور اسی لیئے اپنی تکنیک کے لحاظ سے منفرد ہے۔ نعت میں آنحضور کے اسم مبارک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ اس سرزمین کا ذکر ضرور کیا جاتا رہا ہے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی کہ عشاق کے ہاں اس سرزمین کے ذرے بھی لحل جواہر سے زیادہ قیمتی گنے جاتے رہے اور ہیں۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ نعت حضورؐ کے شمائل کے بیان سے ہٹ کر محض ماحول و احوال تک محدود ہو گئی۔ حالانکہ اس روایت کے پیش رو حضرات کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ نعت کہنے والے محض ان کی ان باتوں کو اختیار کر لیں گے اور حضورؐ کے فیضان کا ذکر کرنا بھول بیٹھیں گے۔ اردو نعت میں یہ رویہ بہت عام رہا مگر برصغیر میں فارسی کے نعت گو حضرات نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیضان و عرفان کو ہی اپنا مطمح نظر جانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فارسی کے اکثر نعت گو شعرا تصوف سے آگاہی رکھتے تھے اور ان کے ہاں وہی صوفیانہ رو چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ غالب نے بھی فارسی روایت کے تتبع میں صوفیانہ مسلک میں نعت کہی۔ جامی کی نعت۔

نسیما جانب بطحا گذر کن
زحال ما محمدؐ راخبر کن

(اے باد نسیم، بطحا کی طرف گزر کر اور میرے حال سے محمدؐ کو با خبر کر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

مدتوں ہمارے ہاں عرسوں پر گائی جاتی رہی مگر اس نعت کے دوش بدوش یہ نعت بھی صوفیاء کے ہاں بہت مقبول رہی۔

اگر خواہی دلیلے عاشقش باش
محمدؐ ہست برہان محمدؐ

(اگر تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر دلیل کا طلبگار ہے تو ان کا عشق اختیار کر کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دلیل آپ ہیں)۔

مگر کسی کو یہ علم نہ ہوا کہ یہ شعر کس کا ہے اور عشق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ڈوبی ہوئی یہ نعت کس نے کہی ہے؟ یہ مضمون اسی بے مثال نعت گو کی فارسی نعت گوئی کے بارے میں ہے۔

نام غلام احمد، تخلص فرخ، ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ اسی (۸۰) کے قریب دینی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ خواجہ میر درد کے خاندان سے صہری تعلق قائم ہوا۔ اولاد بھی علمی اور دینی حلقوں میں منفرد اور ممتاز سمجھی گئی۔ ان کی نعت گوئی میں ان کی صوفیانہ طبیعت اور ترک دنیا کا بھی بہت حصہ ہے۔ کھاتے پیتے جاگیردار گھرانہ سے تعلق تھا مگر بچپن ہی سے علائق دنیا سے بیزار تھے۔ مسجد ان کا ٹھکانہ اور قرآن کی تلاوت ان کی غذا تھی۔ ان کی نعت گوئی محض اوپری نہیں تھی ان کے دل کی کیفیت کی آئینہ دار تھی۔ روایت ہے کہ حضرت خواجہ غلام فرید چاچڑاں شریف والے ان کی نعت بطور خاص سنتے اور وجد کیا کرتے تھے۔ مگر حیف کہ ہمارے اس بے مثال نعت گو کی وہ قدر نہ ہوئی جو ان کا حق تھا۔ (دعویٰ مجددیت سے پیشتر بانی سلسلہ احمدیہ "فرخ" تخلص کے حوالے سے مضامین اور شاعری کیا کرتے تھے۔ ایڈیٹر)

ان کی نعت

درد دلم جوشد ثنائے سرورے
آں کہ درخوبی نہ دارد ہمسرے

قصیدہ کے رویہ میں ہے اور ۱۲۵ اشعار پر مشتمل ہے نعتیہ قصائد اگر ہمارے ہاں کسی نے کہے ہیں تو وہ یہی فرخ ہیں۔ ہمارے ہاں نعت غزل کے رویہ میں یا زیادہ سے زیادہ نظم کے رویہ میں کہی گئی۔ نعت کو باقاعدہ نعتیہ قصیدہ کا رنگ انہیں سے ملا اسی نعت کا یہ شعر صوفیاء پر حال طاری کر دیا کرتا تھا۔

می پریدم سوئے کوئے اودمام
من اگرمی داشتم بال و پرے

(اگر میرے بال و پر ہوتے تو میں ہمیشہ اسی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پرواز کرتا)۔

وہ نعت بھی انہی سے منسوب ہے جس میں آنحضورؐ کی قوت قدسی کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے اور نعت کے رویہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ یہ مضمون نعت گو شعراء کا مرغوب مضمون رہاہے کہ اے کاش انہیں مدینہ میں موت آتے یا ان کی خاک اس خاک کا حصہ بن جاتے جو سر زمین عرب کی خاک کہلاتی ہے۔ مگر "فرخ" کا خیال انوکھا بھی ہے اور والہانہ بھی۔ زمین ہے قربان تست جان من اے یار محسنم۔ شعر ہے۔

گر کوئے تو اگر سر عشاق راز نند
اول کسے کہ لاف تعشق زند منم

"(کہ اگر تمہارے کوچہ میں عاشقوں کے سر قلم کئے جا رہے ہوں تو میں سب سے پہلے تمہارے عشق کا دعویٰ کروں گا)۔"

یہ ۱۸۹۳ء کی نعت ہے اور اس وقت ہمارے ہاں نعت کے رویے بہت مختلف تھے۔

غالب کی نعت کی زمین، سعدی سے آئی ہے۔ اسی زمین میں "فرخ" نے بھی نعت کہی۔ اس کے دو شعر۔

عجب نوریست درجان محمد۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
عجب لعلیست درکان محمد۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(محمدؐ کا نور عجب نور ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کان میں عجیب لعل و جواہر ہیں)۔

دریغا، گر دہم صد جاں دریں راہ
نباشد نیز شایان محمد
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(بلاشبہ اگر اس راہ میں سو جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق کا حق ادا نہیں ہو سکتا)۔

ایسے عاشق رسولؐ کے کلام کا یوں نظرانداز ہو جانا برصغیر میں نعت گوئی کا تاریخ پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اے کاش کسی محقق کو اس بے مثال نعت گو کی نعت گوئی پر تفصیلی کام کرنے کی توفیق ملے۔

ان کے کلام کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور یورپ کی اکثر لائبریریوں میں موجود ہیں۔ پاکستان کی لابریریوں میں ان کی عدم موجودگی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے متعدد کتب خانوں کو لکھا مگر ان کی طرف سے نفی میں جواب آیا۔ البتہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ان کے کلام کی موجودگی سے بہت خوشی ہوئی۔ ہو سکتا ہے ان کے جسمانی و روحانی متوسلین سے ان کا کلام دستیاب ہو سکے۔ عربی نعتیہ قصائد ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی سے مل سکتے ہیں کہ میں نے انہیں پیش کئے تھے۔

ان کے فارسی مجموعہ کلام میں حمد، نعت، دین اسلام کے تفوق اور ملت اسلامیہ کے مسائل پر نیز عام دینی موضوعات پر نہایت دردمندانہ نظمیں موجود ہیں۔" (ماہ نو، جنوری۔ فروری ۱۹۹۶ء۔ شائع کردہ وزارت اطلاعات و نشریات، حبیب اللہ روڈ۔ لاہور)